افسانے

شیطان

شفیق الرحمٰن

ناشر:
• سٹار پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰

• پہلا ایڈیشن (پاکٹ سائز میں)
۱۹۸۲ء

قیمت صرف پانچ روپیے Rs 5.00

طابع: (خواجہ پریس دہلی)

فہرست

۱۔	بڑی آپا	۷ صفحہ
۲۔	دو تارے	۲۳
۳۔	ڈرپوک	۴۷
۴۔	ساڑھے چھ	۶۲
۵۔	مشورے	۸۷
۶۔	شیطان	۱۱۶

بڑی آپا

وہ بھیّا کے ساتھ اکثر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ کئی سال سے دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ پہلے پہل بھیّا جب اس کی باتیں کیا کرتے تو میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ وہ بڑے فخر سے سینہ پھلا کر کہتے۔ آج رفیق نے یہ کیا، وہ کیا، اتنے نمبر لئے۔ فلاں کھیل میں حصّہ لیا۔ ویسے بھیّا اور اس کی جوڑی بھی خوب تھی۔ ایک سے قد، ایک سے جسم اور ایک سی عادتیں۔ دونوں سینما کے عاشق، دونوں کھیل کود کے دیوانے۔ جب سائیکلوں پر ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے سڑک پر جاتے تو دور سے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ البتہ ایک فرق نمایاں تھا، وہ یہ کہ بھیّا ذرا سانولے تھے اور اس کا رنگ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے جو نیلے اور کالے سوٹ اس کے رنگ کو نمایاں کر دیتے تھے وہ بھیّا کو اتنے اچھے نہیں لگتے تھے۔ اور ہاں ایک بات اور بھی تھی، وہ یہ کہ اس کی ناک پر ہر وقت کالے شیشوں کی ایک عینک رکھی رہتی تھی۔ بھیّا کے بتانے پر معلوم ہوا کہ جناب سینما بہت

دیکھتے ہیں جس سے آنکھیں کبھی کبھی سُرخ ہو جاتی ہیں۔ اس لیے یہ عینک لگا رکھی ہے۔

میں اسے چھُپ چھپ کر شیشوں میں سے اور کواڑوں کی آڑ سے دیکھا کرتی۔ دراز قد، چھریرا اور ورزشی جسم، بکھرے ہوئے بال، چہرے پر ایک عجیب قسم کی معصومیت۔ جب بات کرتا تو بچوں کا سا بھولا پن چہرے پر آجاتا۔ کچھ ایسا حسین بھی نہ تھا۔ نہ ہی خط و خال ایسے دلکش تھے۔

وہ تقریباً ہر روز ہمارے ہاں آیا کرتا۔ بعض اوقات بھیا پہلے چلے آتے اور شام کو اس کا انتظار کیا کرتے، جس روز وہ نہ آتا، بے چین ہو جاتے۔ بار بار دروازے تک جاتے اور گھڑی دیکھتے۔ کبھی مجھ سے وقت پوچھتے اور جیسے ہی اس کے سائیکل کی گھنٹی کی آواز کانوں میں آتی ان کا چہرہ دمک اٹھتا۔ فوراً دوڑ کر دوسرے کمرے میں چھُپ جاتے۔ وہ بھاگا بھاگا آتا، نوکر آگے بڑھ کر کہہ دیتا۔ ”وہ تو باہر چلے گئے“ یہ مذاق ہر بار کیا جاتا، مگر وہ ہمیشہ اسے سچ سمجھ لیتا اور واپس مڑنے لگتا۔ بھیا دوڑ کر اس سے چمٹ جاتے اور پھر جو باتیں شروع ہوتیں تو بس خدا کی پناہ، رات کے بارہ بارہ بجے تک دونوں بیٹھے رہتے۔ وہ ریڈیو والے کمرے ہی میں بیٹھتے اور ریڈیو کو ہمیشہ بند کر دیتے کہ باتوں میں مخل ہوتا ہے۔ میرا جی جلا جلتا۔ اگر انہیں داستان امیر حمزہ چھیڑنی ہے تو اس کمرے میں کیوں بیٹھتے ہیں اور پھر ریڈیو بند کیوں کر دیتے ہیں۔ جانتے ہیں ناکہ میں اس بات سے چڑتی ہوں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کواڑوں سے لگی ان کی باتیں سُن رہی ہوں۔

یکایک کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی، میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اگر امی دیکھ لیں تو کیا کہیں۔ وہاں سے ایسی بھاگی کہ اپنے کمرے میں آکر دم لیتی۔ توبہ توبہ ایک لڑکی کے لئے اس سے زیادہ اور کیا بے شرمی ہو سکتی ہے؟ میں قسم کھاتی کہ پھر اسے کبھی نہیں دیکھوں گی۔ بھلا اس میں کیا خاص بات تھی آخر؟ یوں ہی معمولی لڑکوں جیسا تھا۔ بھیا کو اچھا لگتا تھا تو اس کے معنی یہ تو نہیں کہ مجھے بھی اچھا لگے اور پھر ہر بار میں ہی دیکھتی تھی، اس نے کس روز کوشش کی کہ مجھے دیکھے۔

ماشاء اللہ بھیا میں ویسے تو ساری خوبیاں تھیں، مگر ایک ذرا زیادہ نمایاں تھی۔ وہ یہ کہ سگریٹ اتنی بری طرح پیتے تھے کہ کوئی حد تھی نہ حساب۔ امی نے بہتیرا سر کھپایا۔ ابا نے بہتیرا سمجھایا۔ وہ بھی تمباکو کے نقصانات پر لیکچر دیتا رہا۔ مگر شاباش ہے بھیا کو، ایسے چکنے گھڑے نکلے کہ کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ امی سے منہ بنا کر کہتے۔ "بھلا کب پیتا ہوں سگریٹ کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے۔ مجھے پیتے ہوئے" اور واقعی وہ گھر میں پیتے بھی نہیں تھے۔ میں اور ننھا ہم دونوں ان کے پیچھے جاسوس لگے ہوئے تھے۔

ایک شام کو میں کالج سے گھر ذرا دیر سے پہنچی۔ آہستہ سے پردہ ہٹا کر دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ میری آنکھیں مارے خوشی کے چمک اٹھیں۔ بھیا ریڈیو کے سامنے آرام کرسی پر میری طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ سگریٹ کا دھواں ایک عجیب شان سے نکل رہا تھا۔ ویسے تو اپنی طرف سے پوری مورچہ بندی کی ہوئی تھی۔ کرسی میں

دھنسے ہوئے بیٹھے تھے، اور بیٹھے بھی کیا تھے بس لیٹے ہوئے تھے۔ سر پر
آڑا ہیٹ رکھا ہوا تھا تاکہ دور سے سر اچھی طرح نظر نہ آسکے اور دیکھنے
والا یہی سمجھے کہ آرام کرسی کی پُشت پر ایک ہیٹ رکھا ہے۔ میں نے
آہستہ سے کتابیں میز پر رکھیں اور تھا ئیں پر دبے پاؤں آگے بڑھی۔
ایک ہاتھ سے ہیٹ ایک طرف پھینکا اور دوسرے سے سگریٹ
چھین لی۔ بھیا ہڑبڑا کر اٹھے۔ توبہ۔ جو نظارہ میں نے دیکھا بس
دھک سے رہ گئی۔ یہ بھیا نہیں تھے کوئی اور تھا۔ یہ رفیق تھا۔ جو
اوڑھنی چھوڑ کر بھاگی ہوں تو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ سامنے سے
امی آرہی تھیں، دروازے میں ان سے زور کی ٹکر ہوئی "یا وحشت
آخر یہ بچپنا جائے گا کب؟" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔ امی کے لیکچر کی آواز برابر
کانوں میں آرہی تھی۔ رات کو دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ اپنے دل میں
میں کیا کہتا ہوگا کہ یا تو کبھی سامنے نہیں آتی تھی اور یا یکلخت
اس قدر بے تکلفی۔ ؟ اگر وہ بھیا سے کہہ دے کہ " جناب! میرا آپ
کے گھر سگریٹ پینا آپ کی ہمشیرہ صاحبہ پر ناگوار گزرتا ہے"، تو بھیا
کیا کہیں گے کہ کتنی بدتمیز ہے۔

مگر پھر ایک عجیب سے خیال نے دل پر سرور طاری کر دیا۔ کچھ
بھی ہو آخر اس نے بھی تو مجھے دیکھ لیا تھا نا۔ مگر کس حلیے میں۔ میں نے
اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی، چاکلیٹ رنگ کی شلوار، ویسی ہی قمیض
اور ویسا ہی دوپٹہ (جو میں وہیں چھوڑ آئی تھی) گویا مجسم چاکلیٹ!
میں نے اپنے آپ کو کوس ڈالا۔ میرے پاس بہترین جوڑے موجود تھے۔

اچھی سے اچھی ساڑیاں تھیں۔ کاش میں اس روز چمک دار بارڈر والی سبز ساڑی پہنے ہوتی۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سارے دن کی پڑھائی کے بعد کچھ کملایا ہوا سا تھا۔ مگر شاید بجلی کی روشنی میں قدرے گلابی جھلک آ گئی ہو۔

کوئی ہفتہ بعد بھیا بیمار ہو گئے۔ اچھے بھلے کالج سے آئے، شام کو نہ معلوم کیا ہو گیا۔ رات ہوتے ہوتے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ابا جان دورے پر گئے ہوئے تھے۔ امی نوکرانی اور ننھے سمیت دوسرے محلے میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ میں اکیلی گھبرا گئی، فوراً نوکر کو بھیجا کہ رفیق کو بلا لائے۔ اس کے سوا اور میں کر ہی کیا سکتی تھی؟ نوکر چلا گیا مگر میرے دل میں ایک خیال آتا تھا، دوسرا جاتا تھا۔ بار بار یہ سوچتی تھی کہ اس سے بات کیسے کر سکوں گی؟ سائیکل کی گھنٹی بجی، پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھٹکا۔ پھر بھیا کی طرف دیکھ کر لپک کر اندر گیا۔

"یہ کب سے بے ہوش ہیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ میں نے کچھ جواب دیا۔ بہت سے اور سوالوں کا بھی الٹا سیدھا جواب دیا۔ یہ تھی میری اور اس کی پہلی بات چیت۔ وہ بچوں کی طرح شرما رہا تھا۔ سر جھکائے اور بغیر میری جانب دیکھے کوئی سوال پوچھتا اور میں رک رک کر جواب دیتی۔ الفاظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔

پانچ چھ دنوں میں بھیّا اچھے ہو گئے۔ اس کی انتھک تیمارداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہم لوگوں میں کافی گھل مل گیا۔ ادھر ننھا تھا کہ ہر وقت بھیّا رفو، بھیّا رفو کی رٹ لگائے رکھتا۔ کتنی بار سمجھایا کہ بے وقوف کہیں کے، اوّل تو بڑوں کا نام نہیں لیا کرتے اور پھر اگر لیں بھی تو یہ کیا ستم ہے کہ اس بُری طرح سے۔

ہر روز ننھے کی جیب میں چاکلیٹ ہوتے۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا کہ جب ننھا اس کے ساتھ سیر کرنے گیا ہو۔ اور چاکلیٹ کی جگالی کرتا ہوا نہ آیا ہو۔ ایک روز میں نے تنگ آ کر کہہ دیا۔ "آپ ننھے کی عادت بگاڑ رہے ہیں۔ یہ کیا کہ ہر روز سیر کو بھی لے جائیں اور چاکلیٹ بھی لے کر دیں۔ خواہ مخواہ کا بار ہے نا آپ پر!"

"تو آپ ننھے کو میرے ساتھ جانے ہی کیوں دیتی ہیں،" شوق سے روکیے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جو کوئی بھی میرے ساتھ رہے گا، اس کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔" وہ ہنس پڑا۔

ایک روز میں کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔ "تار لے لیجیے!" بھیّا دوڑے گئے اور چیخ کر بولے۔ "بڑی آپا آ رہی ہیں!"

"بڑی آپا آ رہی ہیں سچ مچ؟" میں نے چلا کر پوچھا۔ بھیّا تار لے کر امی کو خبر دینے چلے گئے۔

وہ سال بھر کے بعد آ رہی تھیں۔ امتحان پاس کر چکی ہیں، پھر وہی شیخیاں بگھاریں گی۔ میں تو رات بھر سوئی نہیں تھی۔ پڑھتے پڑھتے گردن اکڑ جاتی تھی۔ جب امتحان دیا تو بخار چڑھا ہوا تھا۔ مگر میں بھی خوب

چھٹلاؤں گی اس دفعہ اس ایک سال ہی میں بھی خاصی سمجھ دار ہو گئی تھی۔

شام کو آپا آگئیں۔ ہم خوب لیٹ لپیٹ کر لیٹے۔ پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو رات کے دو بج گئے۔ یکایک آپا نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

" جو تصویر بھیّا نے مجھے بھیجی تھی۔ اس میں ایک اجنبی لڑکا بھی تھا۔ کون ہے بھلا وہ ؟"

کوئی دوست ہے اُن کا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

" وہ تو مجھے بھی پتہ ہے ' نام کیوں نہیں بتاتی اس کا۔"

" رفیق ہے اس کا نام !" میں نے کہا۔

" نام تو بڑا اچھا ہے اور دیسے خود بھی اچھا ہے۔ ہے نا ؟"

" مجھے کیا معلوم ؟ ہوگا !" میں نے منہ بنا کر کہا۔

مجھے آپا کی یہ تعریف بڑی ناگوار لگی۔ میں نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

" کیوں نیند آگئی کیا ؟" وہ بولیں۔

" ہاں !"

دوسرے روز آپا نے اسے دیکھا۔ باتیں کیں۔ کمرے میں میں اور بھیّا بھی بیٹھے تھے۔ مگر کیا مجال جو آپا نے کسی اور سے ایک بات بھی کی ہو۔ رفیق کے پیچھے اس طرح پڑیں کہ اس غریب کا ناک میں دم آگیا۔ آپا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور رفیق کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ صوفے میں گھسا جا رہا تھا۔ بار بار گفتگو کا رُخ

پلٹتا تھا۔ کہ جھٹکارا ملے۔ ادھر میں بے چین ہو رہی تھی۔ آخر آپا کا مطلب کیا ہے اس قسم کے سوالوں سے۔ بھیا سے کب واقفیت ہوئی تھی؟ گھر میں آنا جانا کب سے ہوا؟ یہ لڑکی (میری طرف اشارہ کرکے) تمہیں ستاتی تو نہیں؟ اچھی لڑکی ہے نا؟ تم بڑے شرمیلے ہو، کیوں ہو اتنے شرمیلے؟ روز آیا کرتے ہو نا؟۔ آپا کو کیا ہو گیا تھا!

اس کے بعد آپا کا زیادہ وقت آئینے کے سامنے گزرنے لگا۔ صبح ہی سے شام کے لئے کپڑے چن لئے جاتے۔ شام کو سیر سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے میک اپ شروع ہو جاتا۔ رفیق بھی پہلے سے زیادہ بن سنور کر آنے لگا۔ بکھرے ہوئے بال سنورنے لگے۔ ٹائی بھی کوٹ کے رنگ کے مطابق ہوا کرتی، یا شاید یہ تبدیلی مجھے ہی محسوس ہوتی ہو، کیونکہ آپا ان دنوں مجھے زہر دکھائی دیتی تھیں۔ بات بات پر رفیق، ہر وقت اسی کا نام۔ جب وہ آجاتا تو گویا آپا کی جان میں جان آجاتی۔ ایسی گرویدہ ہوتیں کہ کسی تیسرے کا خیال نہ رہتا۔ رفیق بہت شرماتا۔ باتیں کرتے کرتے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ گویا شکایت کرتا کہ دیکھ لو۔

آپا سے میں بے حد محبت کرتی تھی۔ ہم بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی تھیں۔ مجھ میں اور ان میں کوئی چھ سال کا فرق ہوگا۔ ویسے بھی وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ مگر جب وہ رفیق کا ذکر کرتیں یا اس سے باتیں کرتیں تو میں دیوانی سی ہو جاتی۔ بہتیرا دل کو سمجھاتی کہ یہ اسے کہیں لے کر بھاگ گئے سے تو رہیں کچھ دنوں کے لئے آئی ہیں،

پھر چلی جائیں گی۔ اور پھر رفیق کون سا میرا ہو گیا تھا۔ فقط یہی تھا کہ مجھے اس سے دلچسپی تھی اور جیسا کہ اس کی باتیں ظاہر کرتی تھیں، اسے بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ اُنس ضرور تھا۔ نہ تو کبھی اس نے اظہار کیا اور نہ میں نے۔ بس اتنی سی بات پر ہر وقت کا چڑنا اور اس قدر جلنا!

سارا قصور آپا کا تھوڑا ہی تھا وہ بھی کہاں کا بھولا تھا۔ آخر ہر روز یوں بن ٹھن کر کیوں آتا تھا؟

ایک روز آپا نے اس کی ٹائی پکڑ کر کھینچ لی اور مسکرا کر بولیں۔ "شریر کہیں کے، ہر روز گلابی ٹائی لگا کر آتے ہو۔ جانتے ہو نا کہ میرے پاس گلابی رنگ کی ایسے پھولوں والی کوئی ساڑی نہیں ہے" میں جل ہی تو گئی۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسی ساڑی آپا کی ہو ویسی ہی ٹائی رفیق کی ہونی چاہیئے! سبحان اللہ، کیا نرالی منطق ہے! اور رفیق بھی بس موم کی ناک تھا۔ اگلے روز سے اس نے وہ ٹائی لگانی چھوڑ دی۔ یہ مرد ایورسٹ پر چڑھ جائیں، سمندر کی تہ تک پہنچ جائیں۔ خواہ کیسا ہی ناممکن کام کیوں نہ کریں، مگر عورت کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ بعض اوقات ایسی احمقانہ حرکات کر بیٹھتے ہیں کہ اچھی بھلی محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور پھر عورت کا دل۔ ایک ٹھیس لگی اور بس گیا۔ جانتے ہیں کہ حسد اور رشک تو عورت کی سرشت میں ہے۔ اپنی طرف سے بڑے چالاک بنتے ہیں۔ مگر مرد کے دل کو عورت ایک ہی نظر میں بھانپ جاتی ہے۔ اور پھر رفیق جیسا پگلا تو کوئی بھی نہ ہو گا۔ میں نے ہزار بار اشارتاً ذکر کیا۔ کئی مرتبہ تو صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے یہ چونچلے نہیں بھاتے۔ مگر اس کے کانوں

پر جوں تک نہ رینگی۔

ایک بہت اچھی فلم آ رہی تھی۔ بھیّا نے پروگرام بنایا کہ شام کو فلم دیکھی جائے۔ رفیق کو بھی بُلایا۔ دوپہر کا وقت ہوگا کہ آپا میرے کمرے میں دوڑی دوڑی آئیں۔ "تیرے پاس کوئی کالی ساڑی ہے"؟ انہوں نے پوچھا۔

"اس رنگ کی کیا؟" میں نے وارڈروب میں رکھی ہوئی ایک گہرے چاکلیٹ رنگ کی ساڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی نہیں! بالکل سیاہ! جیسے میرے بال ہیں۔ جیسا ڈنر سوٹ ہوتا ہے۔" ڈنر سوٹ کا ذکر۔ میں اس نرالی تشبیہ سے حیران رہ گئی۔ آخر تھوڑی دیر کی الٹ پلٹ کے بعد ایک سلک کی سیاہ ساڑی نکال دی۔

"اور بلاوز۔"

"وہ بھی سیاہ رنگ کا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! بالکل سیاہ رنگ کا"

میں نے بلاوز بھی نکال دیا۔ ان کی باچھیں کھل گئیں۔

"بس ٹھیک ہے۔ سیاہ جوتے تو میرے پاس ہیں۔ وہ بھاگ کر کمرے سے نکل گئیں۔

شام ہوئی۔ میں نے ایک سادہ سی ساڑی پہن لی۔ آپا اپنے کمرے سے نکلیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس، سفید چہرہ کالے لباس میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

"آہا آپا! آج آپ کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہیں! چشمِ بد دور"

"چل جھوٹی کہیں کی دیکھ تو سہی! ادھر آ بھلا!" وہ مجھے پکڑ کر آئینے کے سامنے لے گئیں۔ "لے دیکھ تو اس سادی ساڑی میں بھی مجھ سے ہزار درجہ اچھی ہے۔" وہ بولیں۔

"خاک اچھی ہوں۔ آپ تو مجھے بنا رہی ہیں، بس، بھلا کہاں میں اور کہاں آپ؟"

ساتھ کے کمرے سے بھیا کے بڑبڑانے کی آواز آئی "میں تو عاجز آ گیا اس سے۔ یہ رفیق بھی عجیب لڑکا ہے۔ دیکھو تو سہی اب تک نہیں پہنچا۔"

"کیا اب تک نہیں آیا وہ باؤلا؟" آپا نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ یہ الفاظ کچھ چبھتے ہوئے سے محسوس ہوئے۔ آخر آپا اسے باؤلا کہنے والی کون ہوتی ہیں؟

"میں نے آج تک ایسا لڑکا نہیں دیکھا۔" آپا بولیں۔

"اب کب تک انتظار کریں گے۔ چلئے آپا، وہ خود ہی سینما پہنچ جائے گا۔" بھیا نے کہا۔ ہم نے گھڑی دیکھی۔ وقت بہت تنگ رہ گیا تھا۔ اگرچہ آپا مصر تھیں۔ کہ رفیق کا انتظار کیا جائے مگر بھیا نہ مانے۔

ہم سب کار میں جا بیٹھے۔ بھیا نے مجھے آگے بٹھا لیا اور ننھا اور آپا پیچھے بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ یکایک بھیا نے زور سے آواز دی۔ "رفیق!۔ ادھر آؤ، ذرا جلدی کرو۔"

"ننھے تو آگے بیٹھ جا۔" آپا نے کہا۔ "ادھر آ جاؤ رفیق!"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رفیق سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

بالکل سیاہ رنگ کا کوٹ، ویسی ہی بو، ویسا ہی جوتا۔ بھیّا نے ننھے کو آگے بٹھا لیا اور وہ پیچھے جا بیٹھا۔ مجھے آگ لگ گئی۔ اب میں سمجھی کہ آپا نے سیاہ ساڑی کیوں پہنی تھی اور رفیق۔ کتنا مکار نکلا۔ آج تک ہمارے ہاں کبھی سیاہ سوٹ پہن کر نہیں آیا۔ ضرور آپا نے فرمائش کی ہوگی۔ میں نے دوبارہ رفیق کی طرف دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں وہ آنکھوں میں کھُبا جا رہا تھا۔

سینما پہنچے۔ آپا نے سرے کی سیٹ پر رفیق کو بٹھایا اور خود ساتھ بیٹھ گئیں۔ ان کے برابر ننھا بیٹھ گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے ایک سیٹ چھوڑ دی۔ بھیّا کے لئے۔ "آپ! اتنی دور؟" رفیق بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ کیا فلم تھی۔ بھیّا کیا کہہ رہے تھے۔ اور آپا کیا کہہ رہی تھیں۔ کچھ عجیب مدھم سی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے بھدے ڈھنگے سے دھبے ناچ رہے تھے۔ میں جھنک رہی تھی۔ فقط میرے آنسو نہیں نکلے، باقی میرے رونے میں کوئی کسر نہیں رہی۔ آپا اور رفیق ہنس ہنس کر مجھے مارے ڈالتے تھے۔ فلم ختم ہوگئی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ بھیّا نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔ "چلو! ارے یہ کیا اونگھ رہی ہو تم؟" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

بھیّا اور آپا پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "اب تو میں کار چلاؤں گا۔" رفیق نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ پیچھے بیٹھیے!" میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟" وہ حیران رہ گیا۔
بس یونہی! آپ وہاں بیٹھے ہوئے اچھے لگتے ہیں!"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ بھونچکا سا رہ گیا۔
"آپ وہاں بیٹھیے، آپا کے ساتھ!" میں نے منہ پھیر لیا۔
وہ اور آپا پیچھے بیٹھ گئے۔ راستے میں وہ فلم پر تنقید کرتے رہے، مگر میں چپ تھی۔ شاید اگر بولنے کی کوشش کرتی تو بھی نہ بول سکتی۔ میں ساری رات روتی رہی۔ کتنے مکار ہوتے ہیں یہ مرد، ان کے نزدیک ایک دل کی کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی۔ رو رو کر میں نے اپنا تکیہ بھگو دیا۔

آخر صبح ہو گئی۔ اور میری زندگی کا سب سے منحوس دن طلوع ہوا جس روز میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔
بھیا کالج میں تھے۔ آپا کسی سہیلی کے ہاں چلی گئیں۔ امی اوپر تھیں اور ننھا میرے پاس تھا۔ دروازہ کھلا اور رفیق اندر داخل ہوا اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ تھا کہ کسی حد تک ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کچھ ٹھٹکا، بالکل اسی طرح جس طرح وہ بھیا کی علالت والی رات کو شرما سا گیا تھا۔
"ذرا ادھر آئیے، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!"

"کیا ہے؟"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!"

"آپ کو جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہہ دیجئے!" میں نے غصے سے کہا۔

"تو آپ نہیں سنیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"کہہ جو رہی ہوں کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ دیجئے!"

"اچھا۔ آپ کو میری باتیں ناگوار لگتی ہیں!"

"ناگوار لگتی ہیں۔ ناگوار لگتی ہیں" میں نے جھلا کر کہا "بھلا مجھے کسی کی باتیں کیوں ناگوار معلوم ہوں، کوئی کچھ کہے، مجھے کیا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ گویا سوچتا تھا کہ اب کیا کہوں۔

"میں آپ کو ہمیشہ غلط سمجھتا رہا؟"

"مگر میں نے کبھی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے آپ کو غلط فہمی ہوتی۔"

"واقعی آپ نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مگر میری یہ حماقت تھی جو میں نے یوں سمجھا۔ اور اب تک سمجھتا رہا۔ میں اب آپ کو کبھی تکلیف نہ دوں گا۔!"

"آپ کی مرضی۔ میں نے کب آپ سے التجا کی تھی۔"

اس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ اس کے چہرے پر کرب تھا بے چینی تھی۔

"بہت اچھا۔ آپ نے وقت سے پہلے بتا دیا کہ آپ کی نظروں میں میری کیا وقعت ہے۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔ اب جب

سب کچھ ظاہر ہو گیا ہے ایک بات اور بتا دوں۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے بھی اسی قسم کے حالات میں مجھے ٹھکرایا جا چکا ہے۔ مجھے ٹھکرانے والی آپ کوئی پہلی ہستی نہیں ہیں۔ خدا حافظ۔"

اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کے لبوں پر ایک بھیانک سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ وہ چل دیا۔ سر جھکائے ہوئے۔ اس نے پردہ اٹھایا اور بغیر میری طرف دیکھے کمرے سے باہر نکل گیا۔ پردہ ہل رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری قسمت پر ہمیشہ کے لئے پردہ پڑ گیا ہو۔ جی میں آیا کہ اسے آواز دے کر بلا لوں۔ مگر میری زبان نہ ہل سکی۔ حلق خشک ہو گیا۔ میں کوچ پر گر پڑی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں چلاؤں، مگر باوجود انتہائی کوشش کے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لئے کھو دیا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ — آپا دوسرے ہفتے واپس چلی گئیں۔ اتنے دن ہو گئے اس واقعے کو، مگر پھر رفیق ہمارے ہاں نہیں آیا۔ خدا جانے بھیا سے کیا بہانہ کیا ہو گا۔ پھر ایک دن سنا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ نہ اس کا کوئی خط آیا نہ کوئی خبر۔

میرے دل میں ایک پچھتاوا رہ گیا اور ساری عمر رہے گا۔ کاش کہ میں اس کی بات سن لیتی جسے سنانے کے لئے وہ اتنا بے تاب تھا۔ خدا جانے وہ اس روز محبت کا پیغام لے کر آیا تھا یا میری غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا۔

پھر سال کے اندر اندر ہی آپا کی ہمارے ایک رشتہ دار سے

شادی ہوگئی۔

میں سوچا کرتی ہوں کہ میرے اس المیے کا باعث میری کمزوری تھی یا بڑی آپا؟ اس معمے کو آج تک حل نہ کرسکی، مگر اس کا وہ فقرہ کہ "مجھے ٹھکرانے والی آپ پہلی ہستی نہیں ہیں۔" مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔

دو تارے

میں نے دونوں بازو اوپر اٹھائے، پنجوں پر اچھلا اور سر کے بل چھلانگ لگا دی۔ خنک ہوا کے جھونکوں میں سے گزرتا ہوا دھم سے ٹھنڈے پانی میں کودا۔ میری انگلیاں ندی کی تہ سے جا لگیں۔ پھر اچھلا اور پانی کی سطح پر آ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلدستے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ میں پورے زور سے تیرنے لگا۔ ذرا سی دیر کے بعد میں نے گلدستے کو دیکھ لیا جو کافی دور تھا۔ میں پتھروں سے بچتا ہوا بڑی تیزی سے تیرتا جا رہا تھا۔ خوب لمبا سانس لے کر ایک غوطہ لگایا اور پھولوں کے بالکل پاس جا پہنچا۔ یکایک پانی گرنے کا شور سنائی دیا۔ پھوار کے بادل اٹھتے نظر آئے۔ آبشار نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے بے تحاشا تیرنا شروع کر دیا۔ اگر فوراً ہی گلدستہ نہ پکڑ لیا تو آبشار میں پھولوں کی پتی پتی بکھر جائے گی۔ آخر ایک اور غوطے کے بعد میں نے گلدستے کو جا لیا اور شپ سے پکڑ لیا۔ بڑی حفاظت سے اسے کنارے تک لے آیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں کتنی

دُور چلا آیا تھا۔ ندی کے موڑ اور چیڑ کے درختوں نے اس چٹان کو
چھپا دیا تھا جہاں سے چھلانگ لگائی تھی۔ گول گول پتھروں کو پھلانگتا
ہوا کنارے کے ساتھ ساتھ واپس جا رہا تھا۔ وہ چٹان بھی نظر آ گئی۔
حیران رہ گیا کہ اتنی بلندی سے کس طرح کُود گیا تھا۔ دوبارہ کوشش
بھی کروں تو ہمت نہ پڑے۔

پھر اس چٹان پر ایک سفید سا دھبہ بھی نظر آنے لگا جو بڑا ہوتا
گیا۔ یہ پروین تھی۔ میں نے پھولوں کو پھر سے چُنا۔ بھلا ایسے پھولوں
کو کیونکر ضائع ہونے دیتا۔ مُسکراتے ہوئے رنگ برنگے معطر پھول
کتنے پیارے۔ بالکل پروین کی طرح!

چھوٹی پگڈنڈی بھی چکر لگا کر پہاڑ پر چڑھتی تھی لیکن اتنی دیر
کون لگاتا۔ میں سیدھا چل دیا۔ لہلہاتے ہوئے سبزے کو روندتا خودرو
پھولدار پودوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اب پروین
اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں کا چمکیلا سُورج ابھی ابھی جنگلوں سے
طلوع ہوا تھا۔ سرد ہوائیں عجیب سی خوشبو پھیلا رہی تھیں۔ نیلا نیلا
آسمان، اُجلے اُجلے بادل، لہراتی ہوئی ٹہنیاں اور چٹان پر کھڑی پروین،
سنہرے بالوں اور گلابی چہرے والی۔ جس کی لٹیں ہوا کے جھونکوں
سے کھیل رہی تھیں۔

اور جب میں اس کے پاس پہنچ گیا تو وہ مُسکرائی۔ میں نے گلدستہ
اسے واپس دے دیا۔

ایسا عجیب اتفاق ہوا۔ صبح میں تیرنے کے لئے آیا۔ اور پروین
پھول چنتی ہوئی مل گئی۔

ہم دونوں چُپ چاپ چل رہے تھے پھر اس نے کہا کہ میں نے یونہی چند پھولوں کے لئے اتنی بلندی سے چھلانگ لگادی۔ میں نے جواب دیا کہ جب تیرتے ہیں تو چھلانگیں بھی لگاتے ہیں۔

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

میں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا، پوچھا "سگریٹ سُلگا لوں۔"

وہ بولی۔ "ہاں"

"سگریٹ پی لوں۔"

"ہاں!" — پھر خاموشی — میرا جی چاہتا تھا کہ یہ باتیں کرے۔

"یہ وادی کس قدر خوبصورت ہے۔ اُودے اُودے پہاڑوں کی قطاریں یوں لگ رہی ہیں۔ جیسے سمندر کی لہریں ہوں اور جھلمل جھلمل کرتے ہوئے چشمے جیسے چاندی کے تار! ان سفید سفید... بادلوں نے آسمان میں کیسے عجیب گنبد بنا رکھے ہیں۔ دیکھا؟"

"جی!" وہ بولی۔

اب ہم ایک موڑ سے گزر رہے تھے۔

"بلندی پر وہ آبشار تو دیکھی ہی نہیں تم نے۔ کیسی دھندلی سی قوسِ قزح نے اسے محیط کر رکھا ہے۔ چاروں طرف پھوار پڑ رہی ہے۔ یہ پانی ان چمکیلی چوٹیوں سے آ رہا ہے۔ وہ اُجلی اُجلی چوٹیاں جن پر برف جمی رہتی ہے۔ کبھی تم نے یہ پانی چکھا؟ ایسا ٹھنڈا اور شیریں ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اگر تم کہو تو کل وہاں چلیں؟"

"اچھا!"

اب ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے ۔ ان کی کوٹھی پہلے آتی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ اس مختصر سے وقفے میں بہت سی باتیں ہوں ۔

"خوب ! تو ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے ۔ وہ سامنے صنوبر کا اونچا درخت نظر آرہا ہے ۔ آج کیا پروگرام ہے ؟ دوپہر کے بعد سب سیر کو چلیں گے نا ؟ نہیں ؟ ۔ ابا دو بندوقیں لائے ہیں ۔ ایک میں لے چلوں گا ۔ پرندوں کا شکار کریں گے ۔ جو اُس جھنڈ کے پیچھے جھیل ہے وہاں چلیں گے ۔ وہاں ناشپاتیاں بھی ہیں اور سیب بھی، شاید سٹرابری بھی ہو ۔ تم کلیوں اور جنگلی پھولوں کے گلدستے بنانا میں تیار رہوں گا کہ کب وہ تمہارے ہاتھ سے گر کر نیچے بہتے ہوئے نالے میں جا پڑیں اور بس دھم سے چھلانگ لگا دوں ۔"

" لیکن آج دوپہر کے بعد تو ۔ آج ذرا وہ ۔ مجھے کچھ پڑھنا تھا ۔"

اب ان کا گھر آ گیا تھا ۔

میں نے جلدی سے کہا ۔" اچھا لائیے جناب ہمارا گلدستہ واپس کر دیجئے ۔" اور پھول واپس لے لئے ۔

وہ چلی گئی ۔ میں کھڑا دیکھتا رہا ۔

پھر ایک سہ پہر شام کو میں لمبی سیر سے واپس آرہا تھا ۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بالکل تھکا ہوا ۔ گلے میں کیمرہ، بندوق، تھیلے اور نہ جانے کیا کیا الا بلا ۔ گھر اب نزدیک تھا ۔ صرف دو موڑ اور رہ گئے تھے ۔

یکایک میری نگاہ چیڑ کے درخت کی چوٹی پر گئی جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ لمبے لمبے نوکدار پتوں سے ایک بڑا چمکیلا تارا جھانک رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر چکر کاٹ کر اور اوپر پہنچا۔ ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے۔ اور خنکی بڑھ گئی۔ موڑ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک اور تارا چمک بھی رہا تھا، اتنا ہی بڑا، اتنا ہی پیارا۔ پہلے تارے کے بالکل قریب۔

میں مسکراتا ہوا ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ان دو تاروں کو دیکھنے لگا۔ وسیع آسمان میں جہاں لاتعداد ننھے ننھے تارے چمک رہے تھے۔ وہاں یہ دونوں روشن ستارے سب کو خیرہ کئے دیتے تھے۔ ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ جیسے ہاتھ پکڑے ہوئے ہوں اور فضا کی ظلمت میں دوش بدوش چل رہے ہیں۔

کتنی دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ سوچا کہ یہ تارے ضرور پروین کو دکھاؤں گا اور جب گھر پہنچا تو عجیب خبط مجھ پر سوار ہو گیا۔ ساری رات نہ سو سکا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد اٹھتا اور باہر نکل کر دونوں تاروں کو دیکھتا کہ دونوں ساتھ ہی ہیں، کہیں بچھڑ تو نہیں گئے، مگر وہ رات بھر ساتھ رہے۔ جب پچھلے پہر دھندلے ہوئے تب بھی اکٹھے، اور ساتھ ہی غائب ہو گئے۔

اگلی شام کو جب ہم سب سیر سے واپس آ رہے تھے لوہیں نے پروین کو باتوں میں لگا لیا اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اسی موڑ پر پہنچے، جہاں سڑک کے ایک طرف تو اونچا پہاڑ تھا اور دوسری طرف وادی تھی۔

نیچے کہیں اکا دکا روشنی ٹمٹما جاتی اور پھر اندھیرا ہو جاتا۔ بنا چاند آسمان میں تیر رہا تھا۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، بالکل پھیکی سی۔

جہاں دوسرے تاروں کی چمک چاندنی میں ماند پڑ گئی تھی وہاں وہ دونوں تارے بالکل اسی طرح چمک رہے تھے۔ بلکہ چاند سے بھی زیادہ روشن تھے۔

"وہ تارے دیکھ رہی ہو؟" میں نے اشارہ کرکے کہا۔

وہ لمبی لمبی پلکیں اُٹھائے انھیں دیکھنے لگی۔ میں اس کے جگمگاتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"کیسے ساتھ ساتھ ہیں؟" میں نے کہا۔

"اور رات بھر میں انہیں دیکھتا رہا۔ یہ یونہی اکٹھے سفر کرتے رہے، اور غروب بھی اکٹھے ہوئے! مجھے یہ ڈر رہا کہ کہیں بچھڑ نہ جائیں؟"

اور جب اس نے بڑی بڑی مسحور کن آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں بے چین ہو گیا۔ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا پیغام تھا؟ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں؟ اس ہلکے دوپٹے کے حاشیے میں وہ گلابی چہرہ ایک خوابیدہ پھول دکھائی دے رہا تھا، جو ہوا کے جھونکوں سے ابھی ابھی کھلا ہو۔

یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ ایک رنگین اور سہانا خواب ہے۔ آسمان پر دمکتے ہوئے تارے یوں ہی نہیں جھلملاتے۔ ان کے بھی اشارے ہیں۔ رمزیں ہیں۔ شبنم گل سے چپکے چپکے کیا کہہ جاتی ہے۔ چاند سمندر کی لہروں سے رات بھر کیا باتیں کرتا رہتا ہے۔ کنول کے پھول ہوا سے کیا سرگوشیاں کرتے ہیں، یہ ایک راز ہے۔

جب ہم واپس آرہے تھے تو میں انہی تاروں کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "کہتے ہیں کہ ان تاروں کا ہماری زندگی سے کوئی

تعلق ہوتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" وہ سرد مہری سے بولی: "ہوتا ہوگا۔"

وہ یک لخت گھبرا گئی، جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ڈر جائے۔ اس نے پھر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ راستے میں بہت کم باتیں ہوئیں۔ دیر تک سوچتا رہا کہ اس فوری تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

ہمیں پکچر دیکھے عرصہ ہو گیا تھا۔ پندرہ بیس میل دور نیچے ایک سینما تھا۔ پہلے ایک مرتبہ وہاں جا چکے تھے۔ طے ہوا کہ پکچر دیکھی جائے۔ بزرگ حضرات میں سے چند ایک نے اختلاف کیا، لیکن بعد میں وہ بھی مان گئے۔

کار میں میں آگے بیٹھا تھا اور پروین پچھلی سیٹ پر۔ جب ہم ایک اندھیرے جھنڈ میں سے گزر رہے تھے تو میں نے سامنے لگا ہوا شیشہ ترچھا کر دیا۔ اب میں پروین کو دیکھ سکتا اور وہ مجھے۔ پتہ نہیں کار میں کیا باتیں ہوتی رہیں؟ بس میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ مجھے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے نہ جانے وہ کیوں چونک پڑتی اور جونگاہیں نیچی کرتی تو میں تنگ آجاتا۔ یہ معمہ بالکل سمجھ میں نہ آیا۔ نیچے پہنچے، وہاں ۔۔۔ ایک رنگا رنگا طویل کارٹون دکھایا جا رہا تھا۔

اس میں سنو وائٹ ایک بڑی پیاری لڑکی تھی۔ اور سات چھوٹے چھوٹے مسخرے بونے تھے۔ پروین میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ خوب مسکرا رہی تھی۔

میں نے آپا کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بولیں "چپ"!

دوبارہ کہا۔ وہ بولیں "ہشت"!

پروین سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کہہ دوں؟"

بولی۔ "کہہ دیجئے۔"

میں نے زور سے کہا "۔ ایک سنو وائٹ ہمارے ساتھ بھی ہے!"

سب پوچھنے لگے۔ "کون؟"

میں نے پروین کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک قہقہہ پڑا اور شرما گئی۔

"کس طرح بھلا؟" کسی نے پوچھا۔

میں نے آہستہ سے کہا "شکل و صورت بالکل ملتی جلتی ہے۔ بھولی بھالی۔ اور۔۔۔!"

آپا نے مجھے بُری طرح گھُورا۔

جب ہم واپس آنے لگے تو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ پروین کے ساتھ ایک ننھی منی بچی بیٹھی تھی۔ اس کے ریشم جیسے بالوں سے بڑی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ اور ایک نیلا ربن لہرا رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان یہی گڑیا بیٹھی تھی۔

ننھی ٹکٹکی باندھے پروین کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے اس کے ایک کان میں پوچھا۔

"دیکھ رہی ہوں کہ آپا کتنی پیاری ہیں۔" وہ بولی اور میں نے

اس کے ننھے ہونٹ چوم لیے۔

سامنے بھاگتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں میں وہی دو چمکیلے تارے جھانک رہے تھے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، لیکن وہ دونوں اسی طرح دمک رہے تھے۔

"وہ دیکھو دو تارے!"

پروین ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"وہ بائیں طرف کا تارا تمہارا ہے اور دایاں میرا۔" میں نے کہا۔ وہ میری بائیں طرف بیٹھی تھی۔

"جی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

کار کو گیراج میں چھوڑ کر ہم دونوں ان کے گھر کی طرف جا رہے تھے سہانی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ ہم گلاب کے تختوں میں سے گزرے۔ جہاں پھول، کلیاں، پتے سب سوئے پڑے تھے۔ پھر لمبے لمبے سایوں اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں میں سے گزرے۔ ہمیں ننھی ننھی کلیوں نے چھپ چھپ کر دیکھا۔

تاروں کے جھرمٹ نے ہمیں اکٹھے چلتے دیکھا۔ چاند جو اونچے درختوں میں سے جھانک رہا تھا، ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اور چاندنی کوئی گنا تیز ہو گئی۔

میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"ایک بات ہے!"

"کیا؟"

وہ یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے چاہتا تھا کہ کہہ دوں۔!"

"کہہ دیجیے۔"

" اور پھر کہہ دینا ہوتا بھی اچھا ہے، بھلا چھپانے سے کیا فائدہ؟
بات دراصل یہ ہے۔ کہ وہ۔!"

" ہاں ہاں کہیے!" وہ مسکرانے لگی۔ میں گھبرا گیا۔

" بات دراصل یہ ہے کہ مدّت سے کہنا چاہتا ہوں کہ۔"

" ہاں۔!"

" یہی کہ۔۔ یہی کہ یہ تارے بہت چمکتے ہیں۔ اور پھر تارے بھی
خدا نے خوب بنائے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو رات کو بڑا اندھیرا رہا کرے۔"

اب ان کی کوٹھی بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے پھر ہمّت کی۔
ایسے موقعے بار بار نہیں آتے، جو کچھ کہنا ہے اب بھی کہہ دو۔ کیا
بزدلی دکھا رہے ہو۔ میں نے گلا صاف کیا اور بولا۔

" نہیں تاروں کی بات نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے، مجھے ڈر تھا
کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔ لیکن اب کوئی ڈر نہیں، تمہیں برا لگتا ہے
تو لگا کرے۔ میں ضرور کہوں گا۔!"

" ہاں ہاں کہہ دیجیے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

" یہی کہ مجھے اتنے دنوں سے تم سے۔ یعنی مجھے سچ مچ تم سے۔ یعنی۔"

" ہاں ہاں!"

" مجھے تم سے۔ ایک شکایت ہے۔ یہی کہ تم اتنے سادے لباس
کیوں پہنتی ہو جب کہ تمہارے پاس ایسے اچھے لباس ہیں۔"

وہ ہنس دی۔ اب ہم برآمدے میں پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ
میں ہرگز اسے نہیں بتا سکتا۔

کیا تو وہ مسکرا رہی تھی اور کیا بے چین سی ہو گئی۔
وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں ہکّا بکّا کھڑا رہ گیا۔ یہ کیا اسرار ہے؟ اس رویّے میں کیا راز پوشیدہ ہے جسے میں نہیں سمجھ سکا۔ آخر یہ بے رخی کیا ظاہر کرتی ہے؟ میرے ساتھ یہ دفعتاً رنجیدہ کیوں ہو جاتی ہے؟ کس قدر پیچیدہ ہے یہ معمّہ؟

اور یہ پہلی مرتبہ نہیں ہُوا۔ ہر دفعہ ہی ہوتا ہے۔ مسکراتے ہوئے چہرے پر یکلخت خوف کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ کہیں اسے مجھ سے نفرت تو نہیں؟ نہیں نہیں نفرت نہیں ہو سکتی۔ اگر ہوتی تو یہ بتا دیتی مگر بتاتی کس طرح؟ کیونکر کہہ دے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ شاید یہ مجھے صرف ایک رفیق سمجھتی ہے، ایک مخلص رفیق۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتی۔ میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر میں نے تاروں کو دیکھا کہ کہیں بچھڑ تو نہیں گئے۔ مگر وہ بدستور اکٹھے تھے۔ دل کو اطمینان سا ہو گیا۔

دوسرے روز دیکھا کہ سامنے کی کوٹھی میں کچھ مزدور کام کر رہے ہیں۔ چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو ٹینس کا میدان ٹھیک کیا جا رہا تھا۔ لائنیں لگائی جا رہی تھیں۔ میری رال ٹپک پڑی۔ مدت سے ٹینس

کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جی میں آیا کہ ان لوگوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ ہماری اور ان کی کوٹھی کے درمیان ایک چوڑا سا نالا بہتا تھا جس میں مَیں روز نہایا کرتا تھا۔ اس کا پُل آدھ میل پرے تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ سامنے کوئی انگریز کنبہ آیا ہے ان کی ایک لڑکی ہر روز تیرنے آتی ہے۔ مجھے یاد آگیا۔ ایک انگریز لڑکی کو کبھی کبھی نالے کے دوسرے کنارے پر دیکھا تھا؛ لیکن باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

چند دنوں تک ہماری واقفیت ہو گئی۔ اس نے میرے تیرنے کی تعریف کی اور میں نے اس کی چستی اور لباس کی۔ ہم صبح اکٹھے تیرتے، پہاڑ پر چڑھتے۔

وہ کہا کرتی، آپ بہت اچھا تیرتے ہیں۔ آپ کا جسم کتنا موزوں ہے۔ بالکل سپورٹسمین جیسا۔ کبھی ہمارے ہاں بھی آئیے۔ ممی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ میں عموماً ان سے آپ کا ذکر کیا کرتی ہوں ہم لوگ تنہائی سے تنگ آجاتے ہیں۔ ابا باہر گئے ہوتے ہیں ممی کسی سہیلی سے ملنے کئی میل دور چلی جاتی ہیں۔ میں اکیلی گھبراتی ہوں۔ ہمارے ہاں پنگ پانگ بھی ہے اور ٹینس بھی۔ میں مووی کیمرے سے تصویریں اتارا کرتی ہوں۔ ہمارے ہاں رنگ برنگے خوبصورت پرندوں سے پنجرے بھرے پڑے ہیں۔

لیکن میں ٹال مٹول کر جاتا۔

ایک دن پروگرام بنا کر دوپہر کو میرے تیرنے کی فلم اتاری جائے۔ وہ اپنا مووی کیمرہ ساتھ لائی۔ میں نے ایک اونچے پتھر سے چھلانگ

لگائی اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

"مجھے آپ اس پتھر پر لے چلئے!" وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کرکے بولی جو نالے کے وسط میں تھا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن پھر رُکتا ہوا آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لطیف بوجھ کو سنبھال لیا۔ اس نے ایک بازو میری گردن میں ڈال لیا اور دوسرے سے پانی کے چھینٹے اڑانے لگی۔

"نہیں، یہ پتھر کچھ اچھا نہیں۔ وہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے ایک دُور کے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں روشنی بھی تیز نہیں ہے اور وہاں سے تصویر بھی اچھی آسکے گی۔"

میں نے رُخ بدل دیا اور ادھر چلنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں بولی۔

"مجھے ایسے لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں، آپ جیسے بے پرواہ اور خوش باش۔ لیکن اتنی بے پرواہی بھی کس کام کی۔" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ لیکن میں تیزی سے پتھر تک پہنچا اور جلدی سے اسے اتار دیا۔ وہ خاموش ہوگئی، لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور مسکرانے لگی۔ اس کے بعد دیر تک فلم اتارتی رہی۔

:

ایک صبح کو میں سیر سے واپس آرہا تھا۔ باغ سے گزرتے ہوئے

رُک گیا۔ پروین پھولوں کا گلدستہ بنا رہی تھی۔ اور ننھی ساتھ بیٹھی تھی۔ جی میں آیا کہ ان کی باتیں سنوں۔ آخر کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ میں دبے پاؤں پودوں کی آڑ میں بالکل ان کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

ننھی بولی "تو اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گی نا؟"

"ہمیشہ تو رہتی ہوں تمہارے ساتھ۔ ننھی گڑیا!"

"اُوں ہوں۔ میں پوچھتی ہوں آپ ہمارے ساتھ چلیں گی۔ ہماری آپا بن کر؟"

پروین کا دمکتا ہوا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"بتاؤ نا آپا!" ننھی مچلنے لگی۔

"دیکھو نزہت کیسی رنگ برنگی کلیاں ہیں" پروین بولی۔

"نہیں، ہمیں کلیاں نہیں چاہئیں۔ آپ بتایئے کہ چلیں گی ہمارے ساتھ یا نہیں؟"

"ارے! وہ دیکھو کیسی اچھی تتلی اُڑی جا رہی ہے، پکڑ لو تو جانیں" اور جب ننھی بیٹھی رہی تو پروین خود تتلی کے پیچھے بھاگ پڑی۔

شام کو سیر سے واپس آتے ہوئے مجھے موقع مل گیا۔ اور میں نے پروین کو اپنے ساتھ ٹھہرا لیا۔ "آؤ جھیل تک چلیں" میں نے کہا۔

"دیر تو نہ ہو جائے گی؟"

ہم دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔
اُودے اُودے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔
پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے درختوں کی قطاریں چمک رہی تھی جیسے سنہری سنجاف لگی ہوئی ہو۔ آسمان شفق کی سرخی سے جگمگا رہا تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اڑتے چلے جا رہے تھے۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ معطر ہواؤں کے جھونکے تیز ہوتے گئے اور ہم دونوں موڑ تک پہنچ گئے۔ میری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ دونوں تارے ابھی ابھی طلوع ہوئے تھے۔ دل مسرت سے بہکنے لگا۔ میں نے پروین کو دیکھا اور نگاہوں نگاہوں میں اتنا کچھ کہہ گیا کہ زبانی نہ کہہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اس سے سب کچھ پوچھوں گا۔ آج اس معمے کو حل کر کے رہوں گا۔

"تمہیں یہ تارے اچھے لگتے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! بہت!!" وہ بولی

"ارے!" میں وہیں رک گیا۔ "تارا ٹوٹا پروین!"

ان میں سے ایک تارا ٹوٹا اور نورانی لکیر بناتا ہوا غائب ہو گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سہم گئی تھی۔

"کون سا تارا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون سا تھا!"

بہتیرا یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر پتہ نہ چلا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا۔ چیڑ کے درختوں کی نوکدار چوٹیوں پر صرف ایک روشن تارا جگمگا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی چمک بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو جنگل میں سناٹا تھا۔

پھر وہ حقیر سا اندیشہ جسے میں پہلے نظر انداز کر دیا کرتا آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ اور مجھے نہ جانے کیوں یقین سا ہو گیا کہ پر دین کو مجھ سے نفرت تھی۔ شروع سے ہی نفرت تھی اور میں ہمیشہ اسے غلط سمجھتا رہا۔

اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی جھیلوں کی سطح پر میں نے اداسی دیکھی۔ درختوں کے کانپتے ہوئے سایے دیکھے۔ پتوں کی سرسراہٹ میں سرد آہیں سنیں۔ میں نے سوچا کہ پانی کی یہ سطح میری روح کی طرح ہے جس پر تاریکیاں منعکس ہیں۔ جس پر دہشت ناک تاریکی چھائی جا رہی تھی۔ میں نے تھرتھراتی ہوئی ٹہنیاں دیکھیں۔ بڑے بڑے اداس پھول دیکھے جو ڈنٹھلوں پر جھکے ہوئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا نہایت غمگین جگہ ہے۔ یہاں مسرت کی اتنی سی رمق بھی تو نہیں۔ آہیں ہیں، سسکیاں ہیں، رنج ہیں، پھیکے پھیکے خوابوں میں دہشت ہے۔ میں چڑچڑا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سارے مشغلے ختم ہو گئے۔ رات کو کھڑکی میں دو روشنیاں نظر آتیں۔ ایک تو اسی تنہا تارے کی چمک اور دوسری روشنی انگریز لڑکی لوسی کی کوٹھی سے آتی۔

میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ طرح طرح کے رنگ سامنے رکھے

تھے۔ دفعتاً ہم سے دروازہ کھلا اور ننھا اندر دوڑتا ہوا آیا۔ پیچھے پیچھے اور بچے تھے۔ ہاتھ میں کرکٹ کا بلا اور گیند تھی۔

"آہا ہا، تصویر بن رہی ہے۔ کیسی رنگ برنگی تصویر ہے۔ یہ کہاں کی ہے؟"

"کہیں کی بھی ہو۔ تم جاکر کھیلو۔!"

"ہم تو یہ تصویر لیں گے۔ ابھی نہیں۔ جب یہ بن جائے گی تب۔"

"اسی وقت دوڑ جاؤ، ورنہ پٹ جاؤ گے۔"

"اچھا! آپ یہ تصویر ہمیں دے دیں گے نا؟"

"نہیں! ہرگز نہیں!" میں نے غصے سے کہا۔

"اچھا تو ہمارے ساتھ کرکٹ ہی کھیل لیجئے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بولنگ سکھائیں گے۔"

"اس وقت نہیں، پھر کبھی ہو گی۔"

"آج تو ہم آپ کو ضرور لے کر جائیں گے۔"

"میں آج ہرگز نہیں کھیلوں گا!"

"اچھا اگر نہیں کھیلتے تو یہ تصویر ہی۔۔۔"

"شیطانوں!" میں چلا کر بولا۔ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ میں تمہارا ڈرل ماسٹر ہوں۔ یا لنگوٹیا دوست۔ لو یہ رہی تصویر۔ میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

دیر تک بیٹھا پیچ و تاب کھایا کیا۔ پھر کوٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ نوکر کو آواز دی کہ موٹر سائیکل لے آئے۔ دو نوکر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک ہنسا اور دوسرے کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے بھی دانت نکال دیے۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تمہیں بھی ہنسی سوجھتی ہے، صاف صاف بتاؤ کیا بات تھی؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ موٹر سائیکل تو پچھلے ہفتے آپ ہی نے مرمت کے لئے بھیجی تھی۔"

دیر تک کمرے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ منّی کی آواز نے چونکا دیا۔ اس کا ننھا منّا سا ہاتھ میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

"بھیّا۔"

میں چونک پڑا۔ "ایں؟"

"بھیّا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں!"

"آیئے آپا پروین کے ہاں چلیں!"

"نہیں! وہاں نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر مجھے اپنے ساتھ سیر کو لے چلیے۔"

"نہیں! اور کسی کے ساتھ چلی جاؤ، مجھے کام ہے!"

"کوئی بھی کام نہیں آپ کو، آپ یوں ہی رات تک بیٹھے رہیں گے!"

"اب جاؤ! کہا مانا کرتے ہیں بڑوں کا!"

"نہیں! ہم تو سیر کو چلیں گے اور وہاں سے آپا پروین کے ہاں!"

وہ مچل گئی۔

میں نے اسے جھڑک کر کہا۔ "ننھی شور نہ کرو۔"

وہ چپ رہی۔ اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ معصوم آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور دو بڑے بڑے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ چپکے سے باہر جانے لگی۔ میں نے دوڑ کر پکڑ لیا اور گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

کتنی مرتبہ امی نے بھی ٹوکا کہ یہ کیا سارا دن کمرے میں بند رہتے ہو۔ کیا تو صبح سے شام تک قہقہے لگاتے پھرتے تھے۔ اور کیا اب ہر وقت کا لسبور نارہ گیا ہے۔

پروین کے ہاں سے ہر تیسرے چوتھے روز شکایت آتی کہ میں وہاں نہیں جاتا۔ ایک روز ابا بولے، شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں سامنے کے پہاڑ پر ایک انگریز ڈاکٹر رہتے ہیں۔ انہیں دکھا آؤ۔ انہوں نے جس مکان کی طرف اشارہ کیا وہ لوسی کا تھا۔ نالے کے اس کنارے سے دیکھا لوسی اپنے باغیچے میں کھڑی تھی۔ سبز رنگ کا گاؤن پہنے۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا دل میں آیا۔ جھٹ سے شوخ رنگ کی سبز جرسی پہنی، بال سنوارے اور سیدھا چل دیا پل کی طرف۔ لوسی کی کوٹھی اور ہمارے درمیان جو نالا تھا اس کا پل۔

میں نے جلدی سے پل عبور کیا۔ لوسی نے مجھے دیکھا، دوڑی دوڑی آئی۔ اس کا چہرہ اور بھی دمکنے لگا۔ میری شوخ جرسی کو دیکھا اور بڑی تعریف کی۔ پھر میرے بازوؤں کو دیکھتی رہی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیر تک لئے رکھا۔ اس کی امی کہیں باہر تھیں۔ مجھے کوٹھی کا کونا

کوتا دکھایا۔ پرندے دکھلائے، پھر صوفے پر بٹھا کر اپنا البم دکھانے لگی۔
وہ میرا سہارا لئے صوفے کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس کی معطر زلفیں
میرے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ ہم خوب قہقہے لگاتے رہے۔

جب میں لوٹا تو مسرور تھا، مطمئن تھا، سیٹی بجاتا ہوا آرہا تھا
میں نے وہ پل اُچھلتے کودتے عبور کیا۔

اس کے بعد ہم اکٹھے سیر پر جاتے، تصویریں اُتارتے۔ میرا زیادہ
وقت اُن کے ہاں گزرنے لگا۔ پروین جیسے غائب ہوگئی۔ کیا ہوا جو
کبھی کبھار آمنا سامنا ہو گیا۔ روکھا پھیکا سلام ہوا اور بس!

اب میں پھر ہنس مکھ ہو گیا تھا۔ چڑچڑاپن جاتا رہا تھا۔
ایک دن میں اور لوسی دونوں سیر سے واپس آرہے تھے۔ اچھا
خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہم اسی موڑ پر پہنچے۔ میری نگاہیں آسمان
کی جانب اُٹھ گئیں، چیڑ کے درختوں پر ایک تنہا تارا چمک رہا تھا۔
ہم دونوں اسی پتھر پر بیٹھ گئے۔ جہاں کبھی میں اور پروین بیٹھے
تھے۔ اُن لمحات میں میں نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کیا۔
وہ کون سی سُلگتی ہوئی چنگاریاں تھیں جو بھڑک اٹھیں۔ میرا جی بھر آیا۔
لوسی شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ سُن سکا۔ اس تنہا تارے
کو دیکھتا رہا۔

.
.

دن گزرتے گئے اور آخر وہ دن آگیا جب ہمیں واپس جانا تھا۔

ابّا کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میرا کالج بھی کھلنے والا تھا۔ ہم سب واپس جا رہے تھے۔ میرا جی تو نہ چاہتا تھا کہ پروین کے ہاں جاؤں، لیکن آپا کی خشم ناک نگاہوں نے مجبور کر دیا۔ پروین کے ابّا اور امّی بے رُخی سے ملے۔ نہ انہوں نے خود خط لکھنے کا وعدہ کیا اور نہ مجھے خط لکھنے کی تاکید کی۔

پروین بھی انّا اپنے وطن جا رہی تھی۔ اسٹیشن تک اس کا اور ہمارا ساتھ تھا۔ پہلی کار میں سب جا چکے تھے۔ دوسری میں سامان تھا اور میں اور انّا۔

سب سے آخر میں پروین سے ملنے اس کے کمرے میں ڈرتے ڈرتے گیا، جیسے مجھے وہاں جانے کا کوئی حق نہ تھا۔

"خدا حافظ پروین!" میں چپکے سے بولا۔

"خدا حافظ!" اس نے سرد مہری سے کہا اور کھڑکی سے سفید سفید برفانی چوٹیوں کو دیکھنے لگی۔

میں چند لمحے ٹھہرا کہ شاید وہ کچھ کہے لیکن وہ چپ رہی اور میں چلا آیا۔ ذرا سی دیر میں ہم واپس جا رہے تھے۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ سامنے چیڑ کے درخت اودی اودی پہاڑیاں، رنگ برنگے کنج، چمکیلی ندیاں۔ سب اڑے جا رہے تھے۔

سوچتے سوچتے میں نے انّا سے پوچھا۔ "ایک بات بتاؤ گی؟"

"کیا ہے؟"

"انّا تم بہت اچھی ہو۔۔۔ اب تم چلی جاؤ گی، پھر نہ جانے کب تمہاری زیارت ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" وہ خفگی سے بولی۔

"یہی کہ میں کیسا ہوں؟"

"اچھے بھلے ہو!"

"تو پھر پروین کو مجھ سے نفرت کیوں تھی؟ یعنی میں اُسے بُرا کیوں لگتا تھا"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"تمہیں سب پتہ ہے۔ فقط یہ بتاؤ کہ اس نفرت کی وجہ کیا تھی؟ اتنی کوششوں کے باوجود اس کے پتھر سے دل پہ کوئی اثر نہ ہوا اور وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہی۔ آخر کیوں؟"

سننا ہی چاہتے ہو تو سن لو۔ تم اسے محبت کہتے ہو؟ یہ خودغرضی ہے یا محبت؟ تم جیسا خودغرض تو کہیں بھی نہ ہوگا۔ تمہیں کبھی بھی اس کا خیال نہیں تھا۔

"نہیں نہیں۔ یہ مت کہو۔"

"کیوں نہ کہوں؟ تم ذرا سی دلچسپی جتا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ تمہیں پوجنے لگے۔ تم نے اسے دیا کیا تھا جو بدلے میں اتنی توقع رکھتے تھے۔ کبھی اپنے رویے پر بھی غور کیا۔ تم نے اسے کس قدر رنج پہنچائے ہیں؟"

میں پاگلوں کی طرح اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"آج سے دو برس پہلے ایسے ہی دن تھے۔ ہم گرمیوں میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ پروین یہاں مینا کی طرح چہکتی تھی۔ کتنی چنچل تھی۔ کتنی ہنس مکھ۔ سب اس کی شوخیوں سے پناہ مانگتے تھے۔ اس کا منگیتر بھی یہیں تھا!"

"منگیتر؟"

"ہاں! بیگم کا بھتیجا یا بھانجا، عجیب سا لڑکا تھا۔ ایسا باتونی کہ صبح سے شام تک بولتا رہتا تھا۔ بچپن سے رشتہ طے ہوا تھا۔ پروین نے ہوش سنبھال کر صرف اُسے ہی دیکھا تھا!"

"وہ لڑکا کیسا تھا؟ میرا مطلب ہے شکل و صورت میں؟" میں نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"یوں ہی منحنی سا تھا۔ خاص برا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کا منگیتر تھا۔ وہ ہر وقت خوش رہتی تھی، کتنی بھولی سی تو ہے۔ پھر اس کی زندگی میں بڑا منحوس دن آیا ۔۔ وہ لڑکا کہیں چلا گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا۔ خبر آئی کہ اس نے کسی نہایت مالدار لڑکی سے شادی کرلی۔ دراصل اسے پروین کے ابا کی جائداد سے دلچسپی تھی، پروین کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اس لڑکی کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ سدا غمگین رہتی ہے۔ مسکراتی ہے تو ٹھنڈا سانس بھر کر، اس کی ہنسی میں آنسو چھپے ہیں۔ ایک شوخ تتلی کی جگہ اب سنجیدہ اور افسردہ پروین رہ گئی ہے۔ اس کے نازک دل کو اس صدمے سے ایسی ٹھیس لگی کہ وہ کبھی سنبھل نہ سکی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ سب کے سب اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ایک ایک کرکے سب اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یہ اکیلی رہ جائے گی۔ یہ تمہیں کتنا اچھا سمجھتی تھی۔ اس کا اندازہ شاید تم نہ کرسکو۔ مجھ سے تمہاری باتیں کیا کرتی۔۔ تمہاری خوبیاں، تمہارے خلوص کی تعریفیں۔ جس دن تمہیں دیکھ نہ پاتی اسے چین نہ آتا۔ لیکن اسے یہی اندیشہ تھا کہ کہیں تم بھی اسے

نہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ چنانچہ تم نے یہی کیا۔ تم نے اس کے رہے سہے سہارے کو بھی چھین لیا۔ وہ بیچاری ہمیشہ جھجکتی رہی۔ اسے تمہاری باتوں پر اعتبار تھا، لیکن وہ جھجکتی تھی ۔ اور تم ایسے خودغرض نکلے کہ اس کی ذرا پروا نہ کی اور آخری دنوں میں جب تم نے اس سے بولنا چھوڑ دیا تو وہ بہت اداس رہنے لگی۔ جب تم نوسی کی کوٹھی۔!"

اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے دل کو مسوس رہا تھا۔

جب میں اس بھیانک خواب سے چونکا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں ماتم سا تھا۔ ہوا کے اداس جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔

میرے سامنے چیڑ کے درخت، پتھروں کے ڈھیر، پہاڑیاں سب اُڑے جا رہے تھے۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔

میں ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر شفق کو دیکھنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ پر ایک گلابی بدلی کے پاس ایک چمکیلا تارا جگمگا رہا تھا۔

دھندلی دھندلی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اسی تنہا تارے کو!

میں پھر بھی نہ سمجھ سکا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا!

ڈرپوک

اتنے دنوں کے بعد آج صبح موٹر سائیکل کو ہاتھ لگایا۔ اسے چلاتے وقت جیسے ٹھٹک کر رہ گیا اور نظریں سامنے کی کھڑکیوں کی جانب چلی گئیں۔

آج سے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ گلاب کے تختے بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ شبنم کے چمکیلے قطروں سے ہر طرف موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ رنگ برنگے پرندے سریلی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ جب میں نے اور ایک سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی منی گڑیا نے ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی تھی۔

اُس روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر نے مہینہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے بس ایک فقرہ رہ گیا تھا جس کا وِرد وہ کرتی رہتی۔ تم ڈرپوک ہو۔ تم ڈرتے ہو۔ تم یوں ہو ـــ تم فُڈوس ہو۔

کئی بار اس سے کہا کہ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر سائیکل تو چلا ہی لیتا ہوں۔ لیکن موٹر سائیکل کس طرح چلاؤں؟ چلانا تو ایک طرف رہا میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ نہ یہ پتہ ہے کہ چلانے کے لئے کون سی کمانی گھماتے ہیں اور اگر چل پڑے تو روکتے کس طرح ہیں۔

وہ منہ چڑا کر کہتی۔ ڈاکٹر صاحب تو روز چلاتے ہیں، چلانا سیکھ کیوں نہیں لیتے۔

میں کہتا۔ کوئی سبق ہو تو یاد کر لوں۔ وہ تو ہینڈل پکڑ کر ایک دُلتی سی مارتے ہیں اور پھٹ پھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا کھینچا تانی کرتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے موٹر سائیکل ہوا ہو جاتی ہے۔

تب کہا جاتا کہ "تم یہ سب کیوں نہیں کر سکتے؟ بس ڈرتے ہو نا!"

میں سمجھاتا کہ ابھی موٹر سائیکل کے برابر تو ہم خود ہیں، بڑے ہو گئے تو موٹر سائیکل چھوڑ پوری موٹر چلایا کریں گے۔ بھلا کبھی ہمارے جتنے بچوں کو موٹر سائیکل پر چڑھتے کہیں دیکھا ہے؟

اس کے جواب میں ایک تصویر پیش کی جاتی۔ ایک موٹر سائیکل کوئی لڑکا چلا رہا ہے اور ایک لڑکی پیچھے بیٹھی ہے۔ میں بہتیرا کہتا کہ یہ تصویر فرضی ہے۔ یوں ہی کسی نے کھینچ دی ہے، لیکن جواب وہی ملتا کہ بس ڈرپوک ہو!

اختر کے کہنے پر میں طرح طرح کی حماقتیں کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کر کے ابا جان کی سنہری گھڑی کیاری میں بو دی۔ اختر کا خیال تھا کہ پودے میں پہلے تو ننھی منی گھڑیاں لگیں گی پھر ٹائم پیس لگیں گے اور جب پودا بڑا ہو کر درخت بن جائے گا تب کلاک

لگیں گے۔ لیکن باوجود ایک ماہ کی دیکھ بھال اور پانی دینے کے کچھ بھی نہ ہوا۔

پھر اس کے مجبور کرنے پر بہادر بننے کے سلسلے میں آپا جان کی بندوق چلادی۔ جب بندوق چلی تو میں کہیں گرا اور بندوق کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری غلیل تک چھین لی گئی۔ اختر کہتی تھی کہ جو تیز جانور کو جا کر لگتی ہے وہ سالم بندوق ہی ہوتی ہے۔

یہ گولی اور چھرّے یوں ہی بناوٹی چیزیں ہیں۔ اس روز بندوق چلانے پر کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ گولی تو خدا جانے کہاں گئی، البتہ چھت پر ڈبو میاں (جو غالباً بلی سے لڑ کر چھت پر دھوپ سینک رہے تھے) تڑپ کر اچھلے اور ساتھ رکھے ہوئے ٹب میں جا پڑے اور وہاں سے اچھل کر روشن دان میں سے ہوتے ہوئے سیدھے کمرے میں جا گرے۔ جہاں آپا کے پاس ہونے کی خوشی میں پارٹی ہو رہی تھی۔ بھیگے شکنے کو اس انداز سے کمرے میں آتے دیکھ کر خدا جانے ان کی سہیلیوں پر کیا بیتی۔ آپا بیحد ناراض ہوئیں۔ ان کے رنگ برنگے سیٹیاں بجانے والے پرندے سہم کر رہ گئے اور وہ کم بخت طوطا تو یوں دبک گیا جیسے مر ہی گیا ہو۔

پھر پریوں کی بہت سی کہانیاں پڑھنے کے بعد اختر کے کہنے پر ساری رات چھوئی موئی اور نرگس کی کلیوں پر پہرہ دینے میں گزار دی۔ ہم وہاں پریاں پکڑنے گئے تھے۔ اختر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا جال تھا (جس سے ہم تتلیاں پکڑا کرتے تھے) ہم دبے پاؤں پہرہ دیتے رہے۔ جب چاند طلوع ہوا تو ہم اور بھی محتاط ہو گئے۔ اس

رات مجھے بڑا ڈر لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے تھپکیاں آ رہی تھی۔ جب مرغ کی اذان سنائی دی تو اپنے اپنے کمروں میں جا دبکے۔ صبح صبح ہمیں کھانسی بھی ہو گئی اور زکام بھی۔

سہ پہر کو ہم باغ میں کھیل رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے منشی جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اختر کی اور منشی جی کی آپس میں چشمک چوٹ رہتی تھی۔

اختر بولی "جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

بولی۔ "اب یہ جو منشی جی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اگر تم ان کا کان کاٹنا چاہو تو ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔"

میں نے کہا۔ "کاٹ سکتا ہوں۔" وہ بولی بالکل نہیں۔ میں مصر ہوا۔ آخر طے ہوا کہ جب منشی جی اس دفعہ نیت باندھیں تو میں ان کا کان کاٹ دوں۔ شرط بھی لگی۔ اختر دوڑ کر چچا جان کی شکاری چھری لے آئی۔ میں نے اچھی طرح چھری پکڑی اور تاک میں بیٹھ گیا۔ منشی جی سجدے میں گئے۔ اب جو وہ بیٹھے ہیں تو لپک کر ان کا کان پکڑا اور چھری پھیر دی۔ ادھر کان ہے کہ کٹتا نہیں میں ہوں کہ زور لگا رہا ہوں۔ کیا مجال ہے کہ منشی جی ذرا بھی ہلے ہوں۔ بدستور نماز پڑھتے رہے۔ اختر کے قہقہوں پر نوکر آ گئے۔ جو دیکھتا ہوں تو چھری الٹی پکڑ رکھی ہے۔ نوکروں کو دیکھ کر ہم وہاں سے بھاگے۔ کتنے دنوں تک ڈر رہا کہ اگر چھری کی دھار منشی جی کے

کان پر پھیر دیتا۔ تو واقعی ان کا کان میرے ہاتھ میں آجاتا اور پھر خون بھی نکلتا۔

ایک روز ہم آپا کے ساتھ سینما گئے جہاں مکّے بازی کی فلم دیکھی۔ اختر کو مکّہ بازی بہت پسند آئی۔ گھر پہنچ کر کہنے لگی آؤ لڑیں۔ مجھے ان دنوں بخار آتا تھا۔ وہ ساری گرمیاں پہاڑ پر گزار کر آئی تھی اور خوب سرخ ہو رہی تھی۔

پہلے تو ٹال مٹول کی کہ بھلا ایک لڑکی سے کیا لڑوں گا۔ وہ کہنے لگی تم ڈرتے ہو۔ خیر مکّہ بازی ہوئی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے تیز ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ لیا۔ اور جب میں نے اسے پرے دھکیلا تو اس نے دوڑ کر میری کلائی میں اس بری طرح کاٹا کہ اب تک نشان موجود ہے۔ پھر جو روئی ہے تو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ تتلیوں کے سارے پر، چاکلیٹ سے نکلی ہوئی تصویریں، گولیاں، جو کچھ میرے پاس تھا سب کچھ اسے دیا۔ تب جا کر چپ ہوئی۔

میں کچھ ایسا ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اختر کے جنوں بھوتوں کے قصوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ صبح سے شام تک طرح طرح کی بھوتی ٹیخی کہانیاں سنایا کرتی اور میں یقین کر لیتا۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سب سکینڈ شو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو استانی جی پڑھا کر چلی گئیں۔ کمروں میں ڈر لگتا

تھا۔ اس لیئے دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ باہر زور سے بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔

اختر نے ایک کہانی شروع کی۔ "اندھیری رات تھی۔ ایک بہت ہی ڈراؤنے اور اجاڑ جنگل سے ایک ٹرین گزر رہی تھی۔ بڑی طرح بارش ہو رہی تھی۔ ایک بلے خطرناک سے ڈبے میں صرف دو آدمی بیٹھے تھے۔"

مجھے ڈر لگنے لگا۔ یہ اختر بھی خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ بھلا ریل کا ڈبہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ سوچنے لگا شاید اب یہی ہو گا کہ ایک آدمی دوسرے کی مرمت کرے گا۔ یا چلتی ریل سے باہر پھینک دے گا۔ میں نے اپنی کرسی کھینچ کر اس کے نزدیک کر لی۔

وہ بڑے اطمینان سے کہانی سنا رہی تھی۔ "دونوں آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بجلی زور سے کڑکی اور ایک نے دوسرے سے پوچھا "کیوں جناب بھوت پریت پر آپ کا اعتقاد ہے یا نہیں؟"

دوسرا بولا۔ "جی نہیں! قطعاً نہیں۔ اور آپ؟"

پہلا بولا۔ "میرا تو ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ دھواں بن کر اڑ گیا۔

"دھواں بن کر اڑ گیا؟ کہاں اڑ گیا؟" میں نے قریب قریب چیختے ہوئے کہا۔

"بھئی غائب ہو گیا۔ دراصل وہ خود بھوت تھا اور آدمی کا بھیس بدلے بیٹھا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا۔ جو بیچارہ ڈبے میں رہ گیا تھا اس کا کیا حال ہوا ہو گا؟ ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنی کرسی اور نزدیک کھینچ لی۔

وہ ڈراؤنا منہ بنا کر بولی "اور اگر میں یہاں بیٹھی بیٹھی غائب ہو جاؤں؟ بس دھواں بن کر اڑ جاؤں تب؟"

میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اتنے زور سے دبوچا جیسے وہ پچ مچ اڑ جائے گی۔ وہ کہنے لگی۔ "اور جو میں انسان نہ ہوں تب؟ کچھ اور ہوں تو؟"

میں اس قدر ڈرا کہ ایسی سرد رات میں بھی اتنا پسینہ آیا کہ کپڑے بھیگ گئے۔ مدتوں یہی سوچا کرتا کہ کیا ہو جو یہ اختر کوئی چڑیل وغیرہ نکلی ہو۔

ایک رات امی بولیں۔ "ننھے ذرا اندر سے ٹارچ اٹھا لاؤ۔ مالی کہیں باہر جائے گا۔"

میں بڑا دلیر بن کر اندھیرے کمرے سے ٹارچ اٹھا لایا۔

اختر بولی۔ "بڑے بہادر بنتے پھرتے ہو۔ وہ کہانی بھی سنی ہے تم نے اندھیرے کمرے اور ماچس والی؟"

میں سہم گیا۔ "کون سی کہانی؟"

"وہی کہ ایک شخص اندھیرے کمرے میں ماچس لینے گیا۔ اندر سخت تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ادھر ادھر ٹٹول رہا تھا۔ کہ یکلخت اس کے ہاتھ میں ماچس تھما دی گئی!"

ماچس دے دی۔ کس نے؟"

"نہ جانے کس چیز نے دے دی۔ وہ شخص چیخ مار کر باہر بھاگا۔ لوگوں نے بہتیرا تلاش کیا لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ لہٰذا اندھیرے کمرے میں جاتے ہوئے ذرا ہشیار رہنا چاہیئے۔"

اس کے بعد مدت تک میں کسی اندھیرے کمرے میں نہیں گھسا

آخر اس کے بار بار کہنے پر تنگ آکر میں نے تہیہ کر لیا کہ ضرور ایک
روز موٹر سائیکل چلاؤں گا۔ اختر کو یقین تھا کہ سارا ڈر تب تک ہے۔
جب تک موٹر سائیکل چلتی نہیں۔ ایک دفعہ چل پڑے تو بس پھر یوں لگے
گا جیسے معمولی سائیکل چلا رہے ہوں۔

جب کبھی ڈاکٹر صاحب موٹر سائیکل چلاتے تو ہم بڑے غور سے
سارا عمل دیکھتے۔ شروع شروع کی باتیں تو سمجھ میں آجاتیں لیکن بعد میں
جو تین چار حرکتیں اکٹھی کر جاتے اُن کا کچھ پتہ نہ چلتا۔

اختر بولی۔ "تم پوچھ کیوں نہیں لیتے ڈاکٹر صاحب سے۔"

میں نے کہا۔ "بتائیں گے نہیں اور ممکن ہے کہ ناراض ہو جائیں
اور پینے کو سخت کڑوی کسیلی دوائیاں دیں۔"

بولی۔ "تم ڈرپوک ہو۔"

میں جھلا اٹھا اور سینہ پھلا کر بولا۔ آج ڈاکٹر صاحب سے ضرور
پوچھوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب اندر سے نکلے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ ان کے
ساتھ باہر تک گیا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں
نے جو عجیب طرح گھور کر دیکھا تو میں گھبرا گیا۔ اختر کھڑکی کے پردوں سے
جھانک رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔ "سناؤ بچے! کیسے ہو؟"

"جی بالکل اچھا ہوں۔ ایک بات پوچھنے آیا تھا۔ بات یہ ہے کہ۔۔"

"وہ۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم باغ میں جا کر گالیاں اور موجیریں کھا لیا کریں۔"

"کیسے مہمل الفاظ استعمال کر رہے ہو برخوردار! یقیناً بہت برا ابلا لکھتے ہو گے۔ میں استانی صاحبہ سے ضرور کہوں گا۔ گالیوں اور موجیروں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"جناب میں کہہ رہا تھا کہ مولیاں اور گاجریں۔ غلطی سے وہ۔"

"اوہو! اب۔ ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی۔ خوب! ہاں گاجریں مفید ہیں اگر تھوڑی مقدار میں کھائی جائیں تب!"

میں نے بڑی مسمسی شکل بنا کر اختر کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا منہ چڑا دیا۔ میں یکلخت ایک بہادر لڑکا بن گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! ایک بات ہے۔ آپ ناراض تو نہ ہوں گے۔ پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو برخوردار! یقیناً تمہارے سر میں درد ہو گا۔ کیوں؟"

میں پھر گھبرا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کی ٹائی بہت خوشنما ہے۔ بالکل اسی رنگ کی ایک تتلی ہم نے پکڑی تھی!"

ڈاکٹر صاحب شرما گئے۔

اختر نے میرا منہ چڑایا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھا اور میں پھر بوکھلا گیا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! آپ بہت اچھے ہیں۔ اب میں ضرور آپ کا کہا مانا کروں گا۔ آپ جس وقت چاہیں میری زبان دیکھ سکتے ہیں۔ اگر اب آپ کہیں تو

میں حلق بھی دکھا دوں۔ یہ دیکھیئے۔"

ادھر کیا تو وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کیا چونک پڑے۔

"نیکھے! تم ضرور چاٹ میں کھا آئے ہو تمہاری زبان رنگی ہوئی ہے۔ اور دیکھو! یہ بیماری یہاں سے سرپٹ بھاگ گا۔"

اختر نے مجھے پکڑ لیا۔ منہ بنا کر بولی "آپ کی ٹائی نہایت اچھی ہے جناب" "آپ کی مونچھیں بہت بڑھیا ہیں جناب" "آپ بہت اچھے ہیں جناب" ڈرپوک کہیں کے! دو لفظ منہ سے نکلے کہ آپ کی موٹر سائیکل کس طرح چلتی ہے جناب!"

میں نے کہا "کسی اور سے پوچھ لیں گے۔ بجلی کا مستری ہے، ڈاکیا ہے، شوفر ہے، استانی جی ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو بتا ہی دے گا۔" لیکن ہمیں کسی نے نہ بتایا۔ شاید قسم کھا رکھی تھی سب نے آخر ہفتہ بھر کی محنت کے بعد مجھے کچھ کچھ پتا چل ہی گیا کہ سٹارٹ کس طرح کرتے ہیں۔ اب سوال تھا روکنے کا۔ اختر بولی۔ "جب چل پڑے گی۔ تب دیکھا جائے گا۔"

کئی روز تک موقع نہ مل سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ جانے کہاں سے بیہودہ سی موٹر خرید لی تھی۔ جب وہ ایک میل دور ہوتے تب سے ہمیں پتہ چل جاتا کہ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ موٹر کا شور اتنا تھا کہ ہارن کی ضرورت نہیں تھی۔ دو چار مرتبہ موٹر سائیکل بھی لائے، لیکن فوراً واپس چلے گئے۔ پھر یکلخت ان کا آنا جانا بند ہو گیا۔

میں تو دل ہی دل میں خوش تھا لیکن اختر ہر روز مجبور کرتی کہ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔ بڑی منتوں سے کہتا کہ کس طرح بلاؤں آخر؟ ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لئے کم از کم ایک آدھ کو تو ضرور بیمار ہونا چاہیئے۔

ایک صبح ہمیں پتہ چلا کہ چچا جان کے کان میں درد ہے۔ فوراً سوجھی کہ ڈاکٹر صاحب کو چچا جان کی طرف سے فون کیا جائے۔ ہم چوری چوری ٹیلیفون کے کمرے میں گئے اور کمرہ چاروں طرف سے بند کر لیا۔ اختر نے مجھ سے کہا کہ میں موٹی آواز میں چچا جان کی طرح بولوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بھاری سی آواز آئی "ہیلو!"

میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ہے ہے۔ لو و و۔" پہلے آواز بالکل باریک تھی پھر اختر کی چٹکی سے یک لخت موٹی ہو گئی۔

"کون صاحب ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہم ہیں۔ میرا مطلب یہ کہ میں ہوں (پھر بہت موٹی آواز سے) میں ہوں!"

"آپ کی تعریف؟"

"میں ہوں چچا جان۔ اور میرے کان میں درد ہے۔ (میں گھبرا گیا اور آواز پھر پتلی ہو گئی) جناب ڈاکٹر صاحب اس وقت فون پر چچا بول رہے ہیں۔ آپ ذرا تشریف لے آئیے۔

"صاحب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون بول رہا ہے۔ اور میں کہاں آؤں؟" آواز آئی۔

اختر نے میرے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا اور بھاری آواز سے بولی۔ "آپ پہچانتے ہی نہیں ڈاکٹر صاحب! میں ہوں (چچا جان کا

نام لے کر) آپ ذرا آیئے تو سہی!"

"افوہ! ابھی حاضر ہوا!!"

ہم بھاگے سیدھے باغ کی طرف اور فوارے کی آڑ میں چھپ گئے۔ پھٹ پھٹ کرتی ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل کوٹھی میں داخل ہوئی۔ انہوں نے حسب معمول اُسے برآمدے کے سامنے ٹھہرا دیا۔ اور اندر چلے گئے۔ میرا حلق خشک تھا۔ ہونٹوں پر پڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لیکن اختر کو ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور لپکی سیدھی موٹر سائیکل کی طرف۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے ڈانٹا اور ڈرپوک کہا۔ میں ذرا بہادر سا بن گیا۔ ہم نے موٹر سائیکل کو بمشکل ہلا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ طے ہوا کہ پہلے اختر پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور جب میں بیٹھوں تو وہ میری کمر پکڑے۔

جوں ہی اس نے میری کمر پکڑی۔ میں اُچھل کر اُتر کھڑا ہوا۔ کیونکہ اتنی گدگدی ہوئی کہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ "یوں نہیں، یوں تو گدگدی ہوتی ہے۔" بولی۔ "اچھا اب کوٹ پکڑ لوں گی۔" میں پھر بیٹھا۔ اُدھر اس کا ہاتھ لگا اور میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ میں نے کہہ دیا کہ اس طرح تو میں گر پڑوں گا، چلانا تو ایک طرف رہا۔ پوچھنے لگی کہ کہاں گدگدی نہیں ہوتی؟ میں نے کہا کہ بازو پکڑ لو۔ اس نے مضبوطی سے بازو پکڑا۔ ادھر میں پورے زور سے اچھل کر سٹارٹر پر کودا اور موٹر سائیکل سٹارٹ ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب فوراً باہر نکلے۔ "لینا۔ پکڑنا!"

موٹر سائیکل جو تیزی سے چلی ہے۔ کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں جا رہے

ہیں؟ موتیے کے تختوں اور پھول دار بیلوں کو روندتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ فوارے سے بال بال بچے۔ موڑ پر ڈبو میاں کو بچایا ورنہ وہ نیچے ہی آچلے تھے۔ پھر موٹر سائیکل یک لخت تیز ہو گئی۔ ہم نے ایک قلابازی سی کھائی۔ ایک زور دار دھماکا ہوا اور پھر پتہ نہ چلا کہ ہم موٹر سائیکل کے اوپر تھے یا وہ ہمارے اوپر۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بالکل بے ہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی، تو سدا بہار کی ٹہنیوں میں اس طرح اُلجھا ہوا تھا کہ نکلنا محال تھا۔ ہاتھ منہ لہو لہان ہو رہے تھے۔ اب جو ہلنے کی کوشش کرتا ہوں تو بازو شل! دیکھتا ہوں کہ اختر بازو سے چمٹی ہوئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں، لیکن گرفت اسی طرح ہے۔

بڑی مشکل سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب، چچا جان اور نوکر ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنا بازو چھڑانا چاہا۔ بہتیرا کہا کہ اب تو چھوڑ دو ہاتھ، لیکن اس کی گرفت بدستور رہی۔ بڑی مصیبتوں سے ٹہنیوں سے باہر نکالا اور ساتھ ہی میرے بازو سے لٹکی ہوئی اختر! موٹر سائیکل سدا بہار کی گھنی ٹہنیوں کے اُس طرف نکل گئی تھی اور ہم جھاڑی میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ ہمیں دھمکایا گیا۔ ہر قسم کی ڈانٹ دی گئی۔ بزرگوں سے لے کر چھوٹوں تک سب نے ہمیں حسبِ توفیق

لیکچر دیئے۔ ٹیلیفون کو ایک اونچی سی الماری پر رکھ دیا گیا (غالباً وہ یہ بھول گئے کہ ہم میز پر رکھ کر بھی وہاں پہنچ سکتے تھے) ڈاکٹر صاحب نے توبہ کی کہ وہ کبھی موٹر سائیکل پر ہمارے ہاں نہ آئیں گے اور اسی بے ہودہ موٹر میں آیا کریں گے جس سے ہمیں نفرت تھی۔ اختر کے ابا کو یہ ساری کہانی لکھ کر بھیجی گئی اور ہمیں کسی دور دراز اسکول میں بھیجنے کی دھمکی دی گئی۔

کچھ دنوں بعد اختر کہیں چلی گئی۔ مجھے بھی کسی اور جگہ پڑھنے بھیج دیا گیا۔ پھر مدت کے بعد اس کی تصویر آئی۔ جس میں وہ ایسی بنی ہوئی تھی کہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی چھوٹی سی ضدی اختر ہے۔ جس کے ہاتھ اور کپڑے مٹی میں لتھڑے رہتے تھے۔ جس نے میری کلائی میں اس بری طرح سے کاٹ کھایا تھا۔ کئی اور تصویریں آئیں۔ ہر نئی تصویر میں وہ سنجیدہ اور مدبر بنتی گئی۔ پھر سنا کہ اس کی کہیں منگنی ہو گئی۔ اس کے خط آنے بند ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔

آج صبح موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے وقت میں ٹھٹک کر رہ گیا یونہی بیتی ہوئی باتیں یاد آگئیں۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ گلاب کے تختے سرخ ہو رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔

رنگ برنگ پرندوں کی سیٹیاں سُنائی دے رہی تھیں ۔ میں نے جلدی
سے سامنے کھڑکی کی طرف دیکھا کہ شاید پردوں کے پیچھے کوئی نیلگوں
آنکھوں اور سنہرے بالوں والی گڑیا میرا منہ چڑا رہی ہو اور باہر ہاتھ
نکال کر زور سے کہہ دے ۔

"ڈرپوک !"

ساڑھے چھ

ٹن سے گھنٹی بجی اور مَیں تھک کر اپنے کارنر میں سٹول پر آگرا۔
یار لوگوں نے مالش شروع کی۔ بولے گھبرانے کی کوئی بات نہیں،
ابھی دو راؤنڈ اور ہیں۔ ہمت سے کام لو۔ ایک آدھ مُکّا جما دینا۔
اور جیت یقینی ہے۔ پہلے راؤنڈ میں یہی ہوا کرتا ہے۔

اور میں دل ہی میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں
نے چچا جان کے سامنے خواہ مخواہ ٹورنامنٹ کا ذکر کیا۔ اگر وہ یہاں
نہ ہوتے تب کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن اب تو وہ بغور ملاحظہ
فرما رہے ہوں گے۔ اور شاید تبصرہ بھی کر رہے ہوں۔ اُدھر وہ پرنسپل
صاحب۔ نہ جانے وہ کہاں سے آ ٹپکے۔ اگر ان سے واقفیت ہوتی
تو ضرور اسی طرح ہونی تھی کیا؛ ہم بھی قسمت کے دھنی ہیں۔
اب وہ دونوں ہنس رہے ہوں گے۔

کل یوں ہی منہ سے نکل گیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ کہاں ملو گے؟
میں نے کہہ دیا جناب کل تو باکسنگ کا میچ ہے۔ بولے اچھا ہم بھیج

دیکھنے آئیں گے۔ تم نے ایک عرصہ سے ہمیں تنگ کر رکھا ہے۔ اس مرتبہ ہم ضرور تمہیں لڑتے دیکھیں گے۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ بہتیری منتیں کیں۔ آپ وہاں تشریف نہ لایئے، شور مچتا ہے۔ فضول سا ٹورنامنٹ ہے۔ آپ کو ہرگز پسند نہیں آئے گا۔ وقت ضائع ہوگا آپ کا۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن کیا مجال جو وہ مانے ہوں۔ ادھر یہ پرنسپل صاحب بھی شامتِ اعمال سے تشریف فرما تھے۔ کہنے لگے کہ ہم بھی ضرور دیکھیں گے۔

کوئی مقابلہ ہوتا تو بات بھی تھی۔ میرا مقابل ایک بھاری بھرکم سیاہ فام گینڈا تھا۔ جس کے سامنے مجھے کم از کم زرہ بکتر پہن کر آنا چاہیئے تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ تو وزن میں کم از کم ایک دو من زیادہ ہوگا۔ آخر کس طرح مجھ سے اسے لڑا رہے ہیں؟ آتے ہی اس نے وہ اُلٹے سیدھے ہاتھ دیے کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ عرش بریں تک کے تمام چھوٹے بڑے تارے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور اس کے بعد تو بچنا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ منہ بنا کر دانت بھینچ کر جو چھلانگ مارتا تو دھما دھم پندرہ بیس مکّے یک مشت ہی لگا جاتا اور میں سوچتا رہ جاتا کہ کیا کروں؟ اچھے پھنسے! اب تو نجات مشکل ہے۔ کہیں ناک آؤٹ نہ ہو جاؤں اور ساری شیخی دھری رہ جائے۔

خیر دوسرا راؤنڈ شروع ہوا اور میں نے مدافعت شروع کر دی۔ بازو موڑ کر چہرے کے دونوں طرف آڑ بنالی۔ اب وہ ہے کہ مکّے لگا رہا ہے اور میں روک رہا ہوں۔ اس طرح بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔

پھر خیال آیا کہ میں اس سے کہیں ہلکا ہوں۔ ذرا سی ہمت کروں تو اسے تھکا لوں گا۔ اب میں نے قلانچیں بھرنی شروع کیں۔ ایک مُکا دیا اور تڑپ کر برابر سے نکل گیا۔ جتنے میں وہ مڑا ہے اتنے میں ایک اور جڑ دیا اور پھر تیزی سے دوسری طرف دوڑ گیا۔ یہ نسخہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اس پر تھکاوٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ سینہ ہے کہ دھونکنی بنا ہوا ہے۔ بازو لٹک رہے ہیں۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس راؤنڈ میں میں نے اسے بالکل تھکا مارا۔ ریفری نے مجھے ٹوکا بھی کہ یہ کیا کبڈی سی کھیل رہے ہو؟ تیسرے راؤنڈ میں اسے اچھی طرح زدوکوب کیا۔ جو جو حربے یاد تھے اور جس جس سٹائل کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا۔ ان کے مطابق اس کی مرمت کی۔ جب کبھی ادھر سے اس کی لہراتی ہوئی ملائم توند پر مکا لگتا۔ تو قہقہوں کا شور مچتا اور خوب تالیاں بجتیں۔ سب سے زوردار اور دیرپا قہقہہ پرنسپل صاحب کا تھا جو فضا کو زیر و زبر کر دیتا۔ میں نے اسے جلدی ناک آؤٹ نہیں کیا کیونکہ اس کی توند پر مُکا لگنے سے نہایت پیاری اور ترنم خیز آواز نکلتی تھی۔ جس سے تماشائی کافی خوش ہوتے تھے۔ راؤنڈ ختم ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا مُکا بلکہ "ٹکی" لگا کر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

ہمارے کالج کے لڑکے چھلانگیں مار کر رنگ میں آ گئے۔ بڑا شور مچا۔ پھر میں چچا جان اور پرنسپل صاحب سے ملا۔ پرنسپل صاحب نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ بولے "تم نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور اس نے کمال رعونت سے۔ میں تمہاری وجاہت کو دیکھتا تھا۔

کبھی اس کی جہالت کو۔ تمہاری ملاقوت بھی ظرافت سے پر تھی جس سے شرارت ٹپکتی تھی۔"

میں نے موڈبانہ عرض کیا: "افسوس کہ میں نے امانت میں خیانت کر لی۔" وہ قہقہہ لگا کر بولے "کیا لیاقت ہے!"

یہ تھی پرنسپل صاحب سے پہلی ملاقات۔

.

ایک شام کو پاؤں پھیلا کر اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر مزے سے پکچر دیکھ رہا تھا۔ انٹرول میں ایک خاتون نظر آئیں جو اپنے ننھے بہن بھائیوں کے ساتھ بالکل قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بیرے کو بلانا چاہتی تھیں۔ کسی چیز کے لئے بچے ضد کر رہے تھے شاید۔ لیکن ان کی آواز یا ہاتھ کا اشارہ بیرے تک نہ پہنچ سکا۔ آس پاس اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے میری طرف دیکھا کہ میں اسے بلا دوں۔ میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔ بھلا مجھے کیا پڑی جو کسی کو بلاتا پھروں۔ نہ جانے ایسی کیا اشد ضرورت تھی کہ انہوں نے پھر اسے بلانے کی کوشش کی اور پھر میری جانب دیکھا۔ میں نے جواباً تین چار عمدہ کش لگائے اور دھوئیں کے چھلے بنانے لگا۔ وہ کچھ ناراض سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد میں اکثر انہیں دیکھا کرتا جب علی الصبح کالج جاتا تا ایک چوک میں کبھی کبھی نظر آتیں۔ ایک لمبی سی چمکیلی کار

میں۔ شاید کہیں آس پاس ان کا کالج تھا۔

ایک مرتبہ میں نے اسی چوک میں اپنے بالوں پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اُڑایا۔ وہ سمجھیں سلام کر رہا ہے۔ انہوں نے جواب میں مجھے بُری طرح دیکھا۔ اگلے روز پھر میرا ہاتھ یوں ہی ہل گیا۔ انہوں نے بہت بُرا منہ بنایا۔ میں نے جلدی سے بالکل ان کی نقل اُتاری۔ اس کے بعد تو جان بوجھ کر میں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔ خفا ہوئیں۔ منہ پھیرا، منہ چڑایا، چُپ رہیں، لیکن آخر راہ راست پر آگئیں۔ اب میرے سلام کا جواب تو نہ ملتا تھا لیکن بس مسکرا دیتیں۔ آہستہ آہستہ اچھی لگنے لگیں اور میں اُن کا انتظار کرنے لگا۔ اُن کی کار کا نمبر میری ڈائری میں محفوظ تھا۔ ایک روز تو میں بہت ڈرا کہ کہیں ان سے سچ مچ محبت نہ ہو جائے۔

پرنسپل صاحب سے دوسری ملاقات کانسرٹ میں ہوئی۔ ہم کلب میں کانسرٹ کر رہے تھے۔ پروگرام کے ایک حصّے میں قریشی صاحب اور مسز قریشی کی نقل اتاری گئی۔ دونوں میاں بیوی حد درجے کے قنوطی تھے۔ جب دیکھو بسور رہے ہیں (اور جب نہ دیکھو تب بھی بسور رہے ہیں) شیطان کا خیال تھا کہ ان کا ہاضمہ خراب ہے۔ میں کہتا تھا کہ یہ ورزش نہیں کرتے اس لئے ایسے ہیں۔ دو سال کے عرصے میں ہم نے انہیں صرف تین مرتبہ مسکراتے دیکھا۔ وہ بھی ایسے

موقعوں پر جب لوگ ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گئے تھے۔ تب وہ دونوں اس بیزاری سے مسکرائے تھے۔ جیسے سب پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔ قریشی صاحب کا پارٹ میں کر رہا تھا اور مسز قریشی شیطان تھے۔ سانولے ہونے کی وجہ سے اُن پر پاؤڈر کیرپاوڈر جا لگ کیا تھا۔

وہ کہتے تھے (یا کہتی تھیں) کہ میں سفید کپڑے پہنوں گا جیسے کہ اکثر مسز قریشی پہنتی تھیں۔ میں نے انہیں علیحدہ لے جا کر بتایا کہ ایک بالکل سیاہ انسان سفید کپڑے پہنے جا رہا تھا۔ اُدھر سے ایک ننھا سا بچہ اپنے باپ کے ساتھ آ رہا تھا جو فوٹو گرافر تھے۔ بچہ اس شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور اپنے والد سے بولا "وہ دیکھیے اباجان ایک نیگیٹو جا رہا ہے"۔ اس پر ان کے کان کھڑے ہوئے اور وہ باز آگئے۔

شیطان دُبلے پتلے تھے۔ چونکہ ان کا قد مجھ جتنا تھا اس لیے انھیں نیچی کرسی پر بٹھایا گیا تھا تاکہ چھوٹے لگیں۔ قریشی صاحب مُنہ لٹکائے کوئی بیماریوں کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف چہرہ پھلائے مسز قریشی بالکل بیزار بیٹھی ہیں۔ سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔ ایک کتاب اٹھاتی ہیں اور فوراً پھینک دیتی ہیں۔ پھر بیزار ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ قریشی زور سے کھانستے ہیں مسز قریشی چونک پڑتی ہیں۔

"یہ کم بخت زکام مجھے دبوچ بیٹھا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے تو ورمِ جگر دفع ہوا تھا" وہ بولیں۔

"اور مجھے کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ اُدھر گلا ہے کہ الگ پکا دھرا ہے۔" قریشی بولے۔

"آج پھر میری پسلی میں درد ہو رہا ہے۔"

"میری بائیں آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔"

"رات گرمی کس قدر تھی؟"

"اور مچھروں نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آج ہی کاٹیں گے۔" وہ بولے۔

"آج کا دن کتنا پھیکا اور غمگین ہے۔"

"اور رات کس قدر اداس اور ڈراؤنی تھی؛ کتنے تارے ٹوٹے ہیں، توبہ الٰہی!"

(طویل خاموشی)

"سُنا ہے کہ امریکہ کے شمالی حصے میں بڑا زبردست زلزلہ آیا ہے۔ حالات کتنے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں؟" مسز بولیں۔

"اور آسٹریلیا کے جنوب مغربی ساحل پر بڑا سخت طوفان آیا ہے جس سے لوگ بہت سہمے ہوئے ہیں۔"

"میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ عنقریب دنیا سے کوئی سیارہ ٹکرائے گا اور بیچاری دُنیا چکنا چور ہو جائے گی کیسی کیسی مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں۔"

"مجھے بھی ہفتہ بھر سے طرح طرح کے ڈراؤنے خواب آ رہے ہیں۔ رات تو ایک لمبے سے اونٹ نے مجھے نگل ہی لیا تھا۔"

(ایک اور وقفہ)

باہر سے نوکر کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔

مسز قریشی کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ ہاتھ پیروں میں تشنج سا آ جاتا ہے، جیسے ابھی کوئی دورہ پڑے گا۔ غصے سے کہتی ہیں۔ "یہ کم بخت

ہر وقت ہنستا رہتا ہے۔ شاید اسے موت یاد نہیں۔!"

" جو زیادہ ہنستے ہیں، وہی زیادہ روتے بھی ہیں۔ انشاءاللہ جلد مصیبت میں گرفتار ہوگا۔ بھول جائے گا سب چوکڑی۔"

لوگ ہنس رہے تھے اتنے میں ایک خاص قسم کے فلک شگاف قہقہے کی آواز آئی۔ چونکتا ہو کر جو دیکھتا ہوں تو سامنے پرنسپل صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کی نوکدار مونچھیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ مونچھیں حسب معمول تاؤ شدہ تھیں اور نوکیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے گھڑی کی سوئیاں گیارہ بج کر پانچ منٹ پر ہوتی ہیں۔

ان کے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ غور سے دیکھا تو یہ وہی خاتون تھیں جن سے ہر روز اس چوک میں جھڑک ہوتی تھی۔ میں بالکل گھبرا گیا۔ کچھ اپنا پارٹ بھی پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اور پرامپٹر کے سہارے کام چل رہا تھا۔ اب انھیں دیکھ کر ادھر ادھر کی ہانکنی شروع کر دیں۔ فقرے غلط سلط بول رہا تھا۔ یہ غالباً پرنسپل صاحب کی صاحبزادی ہوں گی یا بھتیجی وغیرہ ہوں۔ یا شاید یونہی اتفاقیہ طور پر بیٹھ گئی ہوں ــــ عجب مصیبت ہے۔ میں ہوں کہ بہک رہا ہوں۔ پرامپٹر چیخ چیخ کر پارٹ بتا رہا ہے۔ اس کی آواز لوگ سن رہے ہیں اور خوب ہنس رہے ہیں۔ انھیں پتہ ہی نہیں کہ کیا معاملہ ہے۔ شاید اس لیے ہنس رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسی طرح ہونا تھا۔ ادھر پرنسپل صاحب کے فلک شگاف قہقہوں سے فضا کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ ابھی یہ ڈراما تھائی بھی ختم نہ ہوا تھا کہ مجبوراً پردہ گرا دیا گیا۔ سٹیج پر کسی صاحب کو وائلن

دے کر بھیج دیا گیا۔ لڑکوں نے مجھے جھنجوڑ ڈالا، دھمکایا، چمکارا، منتیں کیں، لیکن میں مچل گیا کہ اب سٹیج پر نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنا پارٹ یاد نہیں۔ باہر لوگ شور مچا رہے تھے۔ آخر تنگ آکر شیطان بولے "تمہاری سزا یہ ہے کہ تم خود سٹیج پر جاکر ان سے کہو کہ مجھے معاف کیجئے، میں اپنا پارٹ بھول گیا ہوں۔"

انہوں نے دھکیل کر مجھے سٹیج پر لا کھڑا کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر یکایک کچھ سوجھ گیا اور میں نے بڑے اطمینان سے کہا "خواتین حضرات! یہ جو کچھ آپ نے دیکھا محض نمونہ تھا جسے 'ٹریلر' کہا جاتا ہے۔ پورا ڈرامہ آپ کو پھر کبھی دکھایا جائے گا۔ اسی ٹریلر سے اندازہ لگا لیجیے کہ اصل چیز کتنی زوردار ہو گی۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن پرنسپل صاحب کے بلند اور دیرپا قہقہے سارے غل غپاڑے پر فوقیت رکھتے تھے۔ اور ان کی مونچھیں بجلی کی روشنی میں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

آخر میں نے شیطان کو ساری بات بتا دی۔ وہ بہت ہنسے۔

پھر پوچھنے لگے "کیا واقعی تمہیں محبت ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں کچھ کچھ ہو گئی ہے۔"

بولے "ان کا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا "پتہ نہیں!"

پوچھا "رہتی کہاں ہیں؟"

"یہ بھی پتہ نہیں! البتہ ان کی کار کا نمبر زبانی یاد ہے!"

"کبھی بات کی ہے؟"

"نہیں تو!" میں نے سچ کہہ دیا۔

"ان کے ابا کی تعریف؟"

"اچھی طرح تو پتہ نہیں، لیکن کچھ اندیشہ سا ہے کہ کہیں پرنسپل صاحب ہی نہ ہوں!"

بولے "حد ہوگئی! اندیشہ سا ہے! اور جو پرنسپل صاحب نہ ہوئے پھر! تم تو زہاد وغیرہ ہی قسم کے انسانوں کو بھی مات کر گئے۔ ایسا عشق تو ہوا کرتا تھا۔ کہیں سن سولہ سو۔ سولہ سو پچیس میں! یہ خواہ نخواہ کی محبت تب ہوا کرتی تھی جب مشرق میں لڑکیاں نہیں تھیں، میرا مطلب ہے سارا دن چھپی بیٹھی رہتی تھیں۔ کہیں کسی کو اتفاق سے دیکھ پایا اور فوراً محبت شروع کر دی ـ اور اب ـ آج کل تو خدا کا فضل ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کے دقیانوسی خیالات بالکل بے موسمے ہیں؟"

"مجھے تو ہر رات ان کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ خوابوں میں ان سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔"

"خوب! تو خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اگر رات کو دستر خوان پر ذرا دیر لگا دی جائے تو پھر خواب نہیں نظر آئیں گے تو اور کیا ہوگا؟ ذرا بھوک رکھ کر کھایا کرو تب دیکھیں کہ کیا نظر آتا ہے۔ مجھے تو سو کر ذرا سُدھ نہیں رہتی۔ صبح حجام ہی جگاتا ہے کبھی پریاں نہیں جگاتیں۔" وہ بولے۔

"آج کل تو تقریباً ہر روز انہیں دیکھتا ہوں۔ اسی چوک میں۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔!"

"تمہاری ہی ہمت ہے جو اتنی گرمیوں میں محبت کا نام لیتے ہو۔ مجھے تو ان دنوں محبت کا ذکر سنتے ہی پسینہ آجاتا ہے۔ میری مانو تو اپنی اس عجیب و غریب محبت کو تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی کر دو۔ تین چار مہینوں کی بات ہے۔ موسم خوشگوار ہو جائے گا۔ تب جو مرضی آئے کرنا"

میں نے ایک لمبی آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھ کر کہا "ردی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج؟ محبت بھی کہیں ملتوی ہوتی ہے بھلا؟۔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب۔ وغیرہ وغیرہ"

"میرا ذاتی نظریہ تو یہی ہے کہ ایک تندرست انسان کو محبت کبھی نہیں کرنی چاہیئے۔ آخر کوئی تک بھی ہے اس میں؟ خواہ مخواہ کسی کے متعلق سوچتے رہو، خواہ وہ تمہیں جانتا ہی نہ ہو۔ بھلا کس فارمولے سے ثابت ہوتا ہے کہ جسے تم چاہو وہ بھی تمہیں چاہے۔ میاں یہ سب من گھڑت قصے ہیں۔ اگر جان بوجھ کر خبطی بننا چاہتے ہو تو بسم اللہ کیئے جاؤ محبت۔ ہماری رائے تو یہی ہے کہ صبر کر لو۔"

مجھے غصہ آگیا۔ یہ شخص ہمیشہ مسخرہ بنا رہتا ہے

"تم بالکل خشک انسان ہو، بلکہ گرم خشک ہو۔ بالکل غیر رومانی قسم کے۔ تم سے ایسی باتیں کرنی فضول ہیں۔ تم ہرگز نہیں سمجھ سکتے" میں نے جھلا کر کہا۔

"اور تم بہت سمجھ سکتے ہو۔ کم از کم تمہیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ایک چھ فٹ کے تندرست انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ

محبت کرے اور اس صورت میں جب کہ وہ صبح سے شام تک ورزش کرتا ہو. تمہاری صحت ہرگز محبت کے قابل نہیں. تم تو جاکر ورزش کرو"
میں غصے سے تلملا اٹھا اور بغیر ایک لفظ کہے واپس چلا آیا.

یکایک وہ خاتون غائب ہوگئیں. اگلے ہفتے پتہ چلا کہ پرنسپل صاحب کا تبادلہ ہوگیا ہے اور وہ خاتون واقعی ان کی صاحبزادی تھیں. بڑا افسوس ہوا. دن بھر سوچتا رہا کہ اگر پتہ ہوتا کہ یہ ان کی صاحبزادی ہیں، تو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہتا. اب تو وہ سب کہیں دور چلے گئے ہوں گے. شیطان کے پاس گیا. ساری بات بتائی اور پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟
وہ بولے "بھلے آدمی! عقل کے ناخن لے. نہ کبھی بات کی تھی نہ کچھ اور. خواہ مخواہ افسوس کرنے سے فائدہ؟ دنیا بہت وسیع ہے اور حادثے بھی ہوتے رہتے ہیں. کیا پتہ کل تجھے کوئی اور چیز نظر آجائے اس سے بہتر. باقی رہا تبادلہ سو اس پر کسی کا زور نہیں، یہ دنیا کا دستور ہے. ہم نے صبر کیا تو بھی کر. انا للہ وانا..."
"آہ پرنسپل صاحب" میں نے ایک سرد آہ بھری. ان دنوں سرد اور گرم دونوں آہیں بڑی آسانی سے بھر سکتا تھا. کافی پریکٹس تھی.
"اب آہ پرنسپل صاحب یا ہائے پرنسپل صاحب کہنے سے کوئی فائدہ نہیں. پرنسپل صاحب کی ذات سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی. ویسے

وہ کچھ اتنے دُور بھی نہیں گئے۔ اور اگر تم ان کی نگاہوں میں آگئے ہو تو وہ
تمہیں نہیں بھولیں گے اور شاید کبھی یاد بھی فرمالیں۔"
میں سوچنے لگا، شاید یاد ہی فرمالیں۔

اور سچ مچ انہوں نے یاد فرمالیا۔ ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں مدعو
کیا اور یہ بھی لکھا کہ کوٹھی میں کافی جگہ ہے۔ میرے پاس ٹھہرنا۔
میں بہت خوش ہوا۔ اُس روز خوب اکڑ اکڑ کر چلا۔ مٹھیاں بھینچ کر سینہ
نکال کر۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اب بہت جلد اُن خاتون کا اچھی
طرح سے منہ چڑاؤں گا اور انہیں سلام کا جواب بھی دینا پڑے گا۔ اور یہ
کہ میں ایک ذمّہ دار اور عقلمند لڑکا ہوں۔ لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے
ہیں تبھی تو پرنسپل صاحب محض دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد اتنے متاثر ہوگئے
ورنہ شیطان بھی تو ہیں۔ سانولے رنگ کے' شتر مرغ کی قسم کے انسان
چہرے پر نہ ذہانت ہے نہ کچھ اور' بالکل کورے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں
تو کسی نے پسند نہیں کیا۔ شاید پرنسپل صاحب اس شام کو مجھے لڑتا دیکھ
کر خوش ہوگئے۔ انہوں نے ضرور میرا نام اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ بس
مرعوب ہوگئے ہیں۔ ولایت میں تو کھلاڑیوں کی قدر ہوتی ہے۔ کیا سپرٹ
دکھائی ہے انہوں نے واللہ! اور پھر میں ہوں کس سے کم؟ ایم۔ اے
کا طالب علم۔ ہمیشہ چوٹی کے لڑکوں میں شمار ہوتا ہوں۔ چند مہینوں میں
ایم۔ اے پاس کرلوں گا۔ پھر مرکزی مقابلے کے امتحان میں شریک ہونگا۔

تب سب کو پتہ چلے گا کہ میں محض ایک کھلاڑی ہی نہیں ہوں. مجھ میں کئی اور خوبیاں بھی ہیں جن کے سامنے پرنسپل صاحب جیسے نقاد نے ہتھیار ڈال دیے.

میں نے تیاریاں شروع کر دیں. پانچ چھ روز کے بعد جانا تھا متوقع گفتگو کی اسکیم بنائی کہ وہ تقریباً کیسی کیسی باتیں کر سکتے ہیں اور ان کے دندان شکن جواب کیا کیا ہو سکتے ہیں. ان کے سامنے گھبرانے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا. سپورٹسمین کبھی گھبراتے ہیں کیا؟

شیطان نے بڑی بدتمیزی دکھائی کہ مبارک باد تک نہ دی. میں نے سوچا رشک آ رہا ہو گا جناب کو. لیکن اتفاق سے جس شہر میں پرنسپل صاحب رہتے تھے وہیں شیطان چند دنوں کی چھٹی پر جا رہے تھے چنانچہ ہم اکٹھے روانہ ہوئے. میں نے دھاریوں والا بہت اچھے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا. اور ویسے ہی رنگ کی پھولدار بو لگا رکھی تھی. بو کچھ تنگ تھی، اس کا ایک سخت سا حصہ بُری طرح چبھ رہا تھا. میری گردن بالکل اکڑی ہوئی تھی. ذرا سا بھی ہلا نہ سکتا تھا. بار بار اسے ڈھیلا کرتا اور وہ گردن میں پھر پیوست ہو جاتی.

شیطان بولے: اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو اس کم بخت کو پھینک دوں ایک طرف، آخر کس حکیم نے کہا ہے کہ ضرور بو لگائی جائے.
مجھے شبہ ہوا کہ حسد سے جل رہے ہیں!

"اور اپنی طرف سے دل میں خوش ہو رہے ہوگے کہ بڑے تیر مارنے جا رہے ہو۔" وہ بولے اور میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ مجھے شیطان کے عزیزوں کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔ اگلے روز پرنسپل صاحب سے ملنا تھا۔ لباس کا انتخاب کرنے لگا اور شیطان کی رائے لی۔ وہ بولے: "کچھ پہن لو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"فرق کیوں نہیں پڑے گا۔ میرے خیال میں تو یہ دھاریوں والا سوٹ اور یہ ٹو سب سے۔"

"خواہ نیکر پہن کر چلے جاؤ یا تہمد باندھ لو۔ اب کوئی فرق نہیں پڑیگا۔"

"آخر کیوں نہیں پڑے گا؟ لباس کی تمیز بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"لباس کا خیال چھوڑ دو، وہ پہلے سے فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"تو گویا مجھے تفریحاً بلایا گیا ہے۔"

"یقیناً!"

"روحی! تم ایک زود رنج اور چڑچڑے انسان ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تمہیں رشک آ رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ حسد سے تمہارا برا حال ہے۔"

اور انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"آخر ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟" میں نے پوچھا۔

"پرنسپل صاحب کو جو کچھ چاہیے، وہ تمہارے ہاں موجود ہے۔ تمہارے ابا کی تنخواہ کافی ہے۔ تمہارے ہاں اچھی سی کار ہے۔ تمہاری جائداد بھی ہے۔ اور بالکل مختصر سا کنبہ ہے۔ بس ان سب باتوں کی جانچ پڑتال کے بعد پرنسپل صاحب راضی ہو گئے ہیں۔ اور تم خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔"

"لیکن کار تو ابّا کی ہے۔ اس سے میرا تعلق؟"

"کچھ بھی سمجھ لو، لیکن انہیں تو یہی چاہیے تھا۔"

"اور اگر یہ سب باتیں ہم میں نہ ہوتیں تو؟"

"تو یہی کہ تم دن رات سکے بازی کرتے۔ تیرنے میں کپوں کی گٹھری جیت لیتے۔

ایم، اے چھوڑ کچھ اور بھی کر لیتے۔ تب بھی تمہیں کوئی نہ پوچھتا۔"

"جھوٹ ہے۔" میں نے جوش سے کہا۔ "بھلا ابّا کی چیزوں کا مجھ سے تعلق؟ میرے پاس تو اپنی قابلیت ہے۔ بلند ارادے ہیں، ہمت ہے!"

"تمہارے پاس سب کچھ ہوگا، لیکن تمہارا انتخاب محض کار وغیرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں، عموماً یونہی ہوا کرتا ہے۔"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ شیطان کو ناک آؤٹ کر دوں۔ یونہی انٹ سنٹ ہانک رہے ہیں۔

"پرنسپل صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ نہایت وسیع خیالات کے انسان ہیں۔ تم ان پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا وہ مجھے محض میری خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔"

"خیر تم مصر ہو تو کرتے ہوں گے۔"

مجھے پھر غصہ آگیا۔ "آخر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"ثبوت؟ ثبوت یہی ہے کہ کل پرنسپل صاحب سے اپنے گھر کے متعلق ذرا اکھڑی اکھڑی باتیں تو کر کے دیکھو۔ پھر پتہ چل جائے گا۔"

"اور جو تمہاری باتیں غلط ثابت ہوئیں تو؟"

تو جو چور کی سزا، وہ میری سزا۔ مگر پھر تمہیں ایک نصیحت کر جاؤں

تو نام بدل دینا۔"

میں سوچنے بیٹھ گیا۔ بتانے کو تو غلط باتیں بتا دوں، لیکن اس کے نتائج نہ جانے کیسے نکلیں۔ کہیں ابا کو پتہ نہ چل جائے۔

"پرنسپل صاحب تو ابا سے ملے ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں! امرت چچا جان سے ملے تھے۔ وہ بھی سرسری طور پر۔"

ذرا سی مزید بحث کے بعد میاں نے فیصلہ کر لیا کہ پرنسپل صاحب کو غلط باتیں بتاؤں گا۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ ان باتوں کا اتنا سا بھی خیال نہیں کریں گے۔ وہ مجھے پسند کرتے ہیں، بھلا اس میں موٹر اور جائیداد کا کیا سوال ہے۔

شیطان مجھ سے ہاتھ ملا کر بولے۔ "آزمائش شرط ہے۔"

شام کو ان کے ہاں جانا تھا۔ میں نے وہی دھاریوں والا سوٹ پہنا۔ پھولدار ٹائی لگائی۔ جس نے میری گردن کو جکڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے اپنی کار بھیجی تھی۔ میں نے شیطان کو بھی ساتھ گھسیٹا کہ چلو تم بھی یہ تماشا دیکھ لو۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ شیطان بہانے سے ان کی لائبریری میں گھس گئے جو ساتھ ہی تھی۔ میں بڑی حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تین ریڈیو رکھے تھے۔ ایک کو استعمال کرتے ہوں گے، دو شاید بگڑے

ہوئے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے کتے، بلّیاں، موطے، بُت، عجیب وغریب تصویریں۔ انگیٹھی، میزیں، الماریاں، سب کی سب ایسی چیزوں سے لدی ہوئی تھیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ آج ہی رکھا گیا ہے۔

خوشبو کی ایک زبردست لپیٹ آئی اور پرنسپل صاحب داخل ہوئے۔ ایک بہت ہی چمکیلے سوٹ میں ملبوس۔ بال بہت اچھے بنے ہوئے تھے، بلکہ استری کیے گئے تھے۔ ان کی دونوں نوکدار بڑھیا مونچھیں بجلی کی تیز روشنی میں نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی تھیں۔ وہ حسب معمول چھت کی جانب اشارہ کر رہی تھیں۔ جیسے کسی ٹائم پیس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہوں۔ نہ جانے انہوں نے روغن مونچھ استعمال کیا تھا یا کوئی خاص مونچھ کریم لگا کر آئے تھے۔

مجھے دیکھ کر تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔ مسکرائے، ہنسے، چلائے، میرے ہاتھ کو دس بارہ بار اس زور سے یوں کھینچا کہ جیسے توڑ کر دم لیں گے۔ ان کا میک اپ دیکھ دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ بھلا یہ انٹرویو کس کا ہو رہا ہے۔ میرا یا اُن کا؟

بولے "کم از کم ایک ماہ تو تم یہاں ضرور ٹھہرو گے۔ نہیں؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تمہیں جانے کون دیتا ہے۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ غیر حاضری لگے گی؟ ــ لگ جائے، کیا پروا ہے! کھیلنے کے لئے یہاں بے شمار کلب ہیں۔ کرکٹ ہے، باکسنگ ہے، ٹینس ہے۔ سب کچھ ہے۔"

جس تیز رفتاری سے وہ باتیں کر رہے تھے میں اُن سے مرعوب

ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کم بخت لو گردن میں بُری طرح چبھ رہی تھی۔ اُسے ٹھیک کرتے کرتے تنگ آچلا تھا۔

"میں نے چھٹی کلب میں تمہیں کھیلتے دیکھا۔ پروفیسر گراوچو تمہاری بڑی تعریف کر رہے تھے۔ اخباروں میں کتنی مرتبہ تمہارے متعلق پڑھا۔ خوب تو تم ایم۔ اے کا امتحان دے رہے ہو۔ ہم نے تمہاری لیاقت کی شہرت بھی سُنی ہے۔ یہ ساری خوبیاں تم میں اکٹھی کیسے ہو گئیں؟ ایم۔ اے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے اور پھر ذہین لڑکے تو کھیلنے میں عموماً پھسڈی ہوتے ہیں۔ نہ جانے تم یہ سب کچھ کس طرح کر لیتے ہو؟"

انہوں نے جوش میں آکر میرے کندھے مسل ڈالے۔

میں سوچنے لگا کہ شیطان بالکل جھوٹ بولتے تھے۔ پرنسپل صاحب تو میری خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ بھلا انہوں نے ہمارے گھر کے متعلق بھی پوچھا ہے کہیں؟ مجھے شرمندہ ہونا چاہیئے۔ توبہ توبہ کیسی کیسی فضول باتیں میں ان سے منسوب کرتا رہا ہوں۔ استغفراللہ!

"تو کم از کم ایک ماہ یہاں رہو گے۔ مجھے تو فقط دو مرتبہ کار کی ضرورت پڑتی ہے۔ دن بھر یہ یونہی کھڑی رہتی ہے۔ تم اسے خوب لئے پھرنا۔ یہ کار کیسی ہے؟ — یہی جس میں تم آئے ہو۔ بیوک کا نیا ماڈل ہے۔ پہلے ہمارے ہاں ڈاج تھی۔ وہ اچھی نہ تھی۔ جی چاہا کہ پونٹیک لے لوں۔ سٹوڈی بیکر پر بھی دل للچایا۔ بڑی عمدہ کار ہوتی ہے۔ لیکن آخر یہی لے لی۔ بھلا تمہارے ہاں کونسی کار ہے؟" میں چونک پڑا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کہوں۔ بُو نزور سے تبھی۔ میں نے جلدی سے اسے ٹھیک کیا۔ پھر عجیب سا منہ بنا کر کہا۔ "ہمارے ہاں؟ — ہمارے ہاں تو کوئی کار نہیں!"

"کیا کہا؟ کوئی کار نہیں؟"

"جی نہیں؟۔ ہمارے ہاں کوئی کار تھی ہی نہیں۔ البتہ مربعوں پر چند اونٹ ضرور ہیں۔"

"لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔"

اُنھوں نے یوں منہ بنایا کہ جیسے بچے کونین مکسچر پی کر بنایا کرتے ہیں۔

"جی یونہی کسی نے غلط بتادیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

ان کی دونوں تنی ہوئی تاؤ شدہ مونچھیں یک لخت ڈھیلی پڑ گئیں اور اب وہ بالکل خطِ مستقیم بنا رہی تھیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں سوا نو بجے ہوتی ہیں۔

"آپ خاموش ہوگئے" میں نے مؤدبانہ کہا "کیا ہوا کار ہوتی نہ ہوتی اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟"

"ہاں! ہاں کوئی بات نہیں۔ وہ تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ لیکن مجھے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔ خیر!"

اُن کا جوش و خروش کچھ کم ہوگیا تھا۔ اپنی انگلیاں چٹخانے لگے۔ پھر بولے۔

"آج کل آبا کہاں ہیں؟"

"پنشن ہوگئی ہے۔ کشمیر گئے ہوئے ہیں۔" حالانکہ پنشن ملنے میں ابھی کئی سال باقی تھے۔

"اوہو! پنشن پر ہیں۔ لیکن مجھ سے کسی نے کہا تھا ابھی سروس میں ہیں۔"

"یونہی کسی نے کہہ دیا ہوگا۔"

پرنسپل صاحب نے پھر بہت برا منہ بنایا۔

"اور ہاں! تمہاری زمینیں۔؟"

"اچھا! ماموں جان کے مربعوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل وہ ہمارے نہیں، ساری جائداد ماموں جان کی ہے۔"

"وہ زمینیں بھی تمہاری نہیں؟" وہ چلا کر بولے۔ "غضب خدا کا! تو کیا سچ مچ وہ کسی اور کی ہیں؟"

"جی ہاں! سچ مچ! نہ جانے کس نے آپ کو ساری باتیں غلط بتا دیں۔"

"لاحول ولاقوۃ! کار والی بات بھی غلط۔ سروس والی بھی غلط۔ جائداد والی بھی غلط، لاحول ولاقوۃ!"

"میں اس مرتبہ ایم، اے کے امتحان کی تیاری!" میں نے شروع کیا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ ابھی ایم اے کے امتحان میں بڑے دن ہیں؟ اسے چھوڑو۔ تمہارے چھوٹے بھائی کہاں ہیں آج کل؟"

"کون سے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"لاحول ولا۔ تمہارے چھوٹے بھائی کا۔!"

"جناب ہم کل آٹھ بھائی ہیں!" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ انہوں نے ایک چیخ ماری۔ "آٹھ بھائی ہیں؟ لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ۔۔ خدا کی مار۔ تو گویا سچ مچ آٹھ بھائی ہیں۔۔ اور کار والی بات بھی غلط ہے؟۔ لاحول ولاقوۃ۔"

پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعتہً اتر گیا۔ ان کی چمکدار مونچھیں

اور نرم ہو گئیں اور یک لخت ڈھلک سی گئیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر بیس منٹ پر ہوتی ہیں۔

"تو گویا مجھے بالکل غلط باتیں بتائی گئی ہیں۔ یقین نہیں آتا۔ لاحول ولا۔ سچ مچ تمہارے ہاں کار نہیں ہے۔ عجب تماشا ہے۔ مجھے تو بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ۔"

"قبلہ گستاخی معاف! آپ پانچ منٹ میں سات آٹھ مرتبہ لاحول پڑھ گئے ہیں!"

"اوہو! خیال نہیں رہا۔ لیکن سوچو تو سہی ذرا، سب کی سب باتیں غلط بتائی گئیں۔"

پرنسپل صاحب نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

میں نے سنجیدگی سے کہا "آپ برا نہ مانیے، مجھ میں نقائص نکالیے۔ بھلا آیا جان کی کار ہو یا ان کی جائیداد، اس سے میری خوبیوں میں تو کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایم اے کا امتحان دینے والا ہوں، ضرور پاس ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد کئی مقابلوں میں شامل ہو سکتا ہوں۔ ابھی ابھی آپ نے مجھے ذہین کہا ہے۔ میرے ارادے بلند ہیں۔ مجھ میں ہمت ہے۔ آپ میرے پرانے سرٹیفکیٹ دیکھ لیجیے۔ اور وہ۔!"

"ہاں ہاں، یہ سب ٹھیک ہے۔ خدا کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔ لیکن مجھے تو ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارے ہاں۔۔ ویسے تم بھی سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن وہ۔ یعنی کہ مجھے سچ مچ غلط بتایا گیا۔"

پرنسپل صاحب نے پھر بہت بُرا منہ بنایا۔
"اور ہاں! تمہاری زمینیں ۔؟"
"اچھا! ماموں جان کے مربعوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل وہ ہمارے نہیں، ساری جائداد ماموں جان کی ہے۔"
"وہ زمینیں بھی تمہاری نہیں؟" وہ چلّا کر بولے۔ "غضب خدا کا۔ تو کیا سچ مچ وہ کسی اور کی ہیں؟"
"جی ہاں! سچ مچ! اللہ جانے کس نے آپ کو ساری باتیں غلط بتا دیں۔"
"لاحول ولاقوۃ! کار والی بات بھی غلط۔ سروس والی بھی غلط۔ جائداد والی بھی غلط، لاحول ولاقوۃ!"
"میں اس مرتبہ ایم اے کے امتحان کی تیاری!" میں نے شروع کیا۔
"لاحول ولاقوۃ۔ ابھی ایم اے کے امتحان میں بڑے دن ہیں؟ اسے چھوڑو۔ تمہارے چھوٹے بھائی کہاں ہیں آج کل؟"
"کون سے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔
"لاحول ولا۔ تمہارے چھوٹے بھائی کا۔!"
"جناب ہم کل آٹھ بھائی ہیں!" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
انہوں نے ایک چیخ ماری۔ "آٹھ بھائی ہیں! لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ ۔۔ (زور سے) تو گویا سچ مچ آٹھ بھائی ہیں ۔۔ اور کاروالی بات بھی غلط ہے؟ ۔۔ لاحول ولاقوۃ۔"
پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعتاً اتر گیا۔ ان کی چک دار مونچھیں

"اچھا — !"

انہوں نے ایک ڈھیلا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ ملا کر بلکہ ہاتھ چھوا کر میں نے مؤدبانہ سلام عرض کیا اور چل پڑا۔

دروازے سے جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ دونوں نوک دار مونچھیں بالکل لٹک رہی تھیں۔

پرنسپل صاحب کی بڑھیا مونچھوں میں ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

د [illegible] زینے پر شیطان ملے۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔ بو ایک مرتبہ پھر چھینکی، اس دفعہ میں نے اُسے نوچ کر پرنسپل صاحب کے لان میں پھینک دیا۔

کوٹھی کے دروازے پر شیطان نے ایک زبردست فلک شگاف قہقہہ لگایا اور مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ہم کتنے زور سے ہنسے؟ اس کا اندازہ تو نہیں، البتہ آس پاس کے درختوں پر جتنے پرندے بسیرا کر رہے تھے۔ وہ سب کے سب اُڑ گئے۔

ان باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ اب کسی چوک میں گزرتی ہوئی کار کو دیکھ کر ہرگز نہیں ٹھہرتا۔ کسی خاتون کو دیکھ کر اگر میرے بالوں پر مکھی بیٹھی بھی ہو تب بھی نہیں اُڑاتا۔ نہ کبھی کسی خاتون کو سلام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ رات کو ہمیشہ بھوک رکھ کر سوتا ہوں۔

اور جب کبھی کھیل کود کے بعد زیادہ تھک جاتا ہوں تو آنکھیں

مُنڈنے لگتی ہیں۔ غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ پرانی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ نظروں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے ٹکڑے ناچنے لگتے ہیں۔ کچھ تصویریں بن جاتی ہیں۔ پھر وہ متحرک ہو جاتی ہیں۔

تب سامنے رکھے ہوئے ٹائم پیس کے گرد ایک ہالہ بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی شام کو ساڑھے چھ بجے ایک جوڑی بڑھیا' نوکدار' چمکیلی' تاؤ شدہ مونچھیں یاد آجاتی ہیں۔ جن پر پہلے گیارہ بج کر پانچ منٹ تھے۔ پھر سوا نو اور اسی طرح اخیر میں ساڑھے چھ بج گئے تھے۔

مشورے

(ریڈیو کا ایک فیچر)

اناؤنسر۔ "خواتین وحضرات! اس مہینے ہمیں طرح طرح کے مشورے موصول ہوئے۔ پہلے تو ہم ہچکچائے لیکن چونکہ جدّت کو ہر جگہ پسند کیا جاتا ہے۔ اس لئے انہیں پیش کرتے وقت ہمیں ذرا بھی تامل نہیں ہے۔ خود ہی سوچیے جہاں ایک کرکٹ کا میچ نشر ہو سکتا ہے اور مشاعرے نشر کئے جا سکتے ہیں وہاں ایک لڑائی کیوں نہیں پیش کی جا سکتی؟ یا ایک قدرتی نظارے کو کیوں نہیں بیان کیا جا سکتا؟

جن صاحب نے ہمیں یہ مشورے بھیجے ہیں ہم ان کے احسانمند ہیں۔ انہوں نے ہماری توجہ روزمرّہ کی ROUTINE چیزوں سے ہٹا کر ایک ترقی پسند راستے کی جانب مبذول کرائی ہے اور ترقی پسند باتوں پر تو لوگ جان چھڑکتے ہیں۔

آج ہم اس فیچر میں تین مشورے پیش کر رہے ہیں، جو یکے بعد دیگرے نشر کئے جائیں گے۔ بقیہ مشورے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

۱۔ جنگ

سب سے پہلے ہم ایک پچ پڑی کی جنگ نشر کرتے ہیں۔

یہ جنگ مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی ہوگی۔ کہاں؟ مغربی گھاٹ کے کسی ناہموار میدان میں یا شاید مشرقی گھاٹ کے آس پاس۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ یہ کہیں وسطی سطح مرتفع پر ہی نہ ہوتی ہو۔

دونوں فوجیں لڑائی پر کیوں آمادہ ہیں؟ — اس کی وجہ "بابر میموریل شیلڈ" بتائی جاتی ہے۔

سامعین! اس سے پہلے اس شیلڈ کے لئے مرہٹوں نے لاکھ کوشش کی، اچھی سے اچھی ٹیم بھیجی۔ ہمارا مطلب فوج سے ہے۔ لیکن ہمیشہ مغل ہی جیتتے رہے۔ کیونکہ ان کی صحت کہیں بہتر تھی۔ اس مرتبہ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ ہم چند انگریزی الفاظ استعمال کریں گے۔ آپ چنداں خیال نہ فرمائیں، یہ ہم مجبور ہو کر کر رہے ہیں۔ ہاں تو اس سالانہ لوڑ نامنٹ کی چوتھی جنگ پیش کی جا رہی ہے۔

اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہیں۔ سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سب کو تھپکیاں آ رہی ہیں۔ سورج ابھی ابھی نکلا ہے۔ امید ہے دوپہر کو خاصی گرمی ہو جائے گی۔ میدان جنگ کی گھاس چند روز ہوئے کاٹی گئی تھی۔ لیکن میدان پر اوس بہت پڑی ہوئی ہے۔ کہیں لوگوں کے اور گھوڑوں کے پاؤں نہ پھسلنے لگیں۔ سفید لائنیں لگائی جا رہی ہیں۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑے خیمے کے نیچے بے شمار سپاہی

کھڑے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہزاروں ہوں گے، ہزاروں نہیں تو لاکھوں ضرور ہوں گے۔ مغل اور مرہٹے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں یہ لوگ لڑائی سے پہلے کبھی نہ ملتے تھے۔ لیکن اب پورے دشمن بن گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے سفر کے حالات پوچھ رہے ہیں۔ کچھ نعرۂ جنگ لگانے کی مشق کر رہے ہیں اور چند سپاہی پنجے لڑا رہے ہیں۔ پورے آٹھ بجے لڑائی شروع ہوگی۔ صرف پچیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

پہلے لڑائی کے فیصلے کے متعلق بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو فیصلہ بالکل نہیں ہو سکتا تھا کہ کون جیتا ہے۔ مرہٹے کہتے تھے ہم جیتے ہیں اور مغل کہتے تھے ہم۔ چنانچہ اس سال دو امپائر آئے ہیں۔ ایک امپائر بنگال سے بلایا گیا ہے اور دوسرا بلوچستان سے۔ ان دونوں کو اس لڑائی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس لئے ہمیں امید ہے کہ فیصلہ غیر جانبدارانہ ہوگا اور بلا حیل و حجت قبول کیا جائے گا۔

سامعین! پچھلے سال جنگ ختم ہوئی۔ اور جب فیصلہ سنایا گیا تو اس قدر ناپسند کیا گیا کہ لڑائی دوبارہ شروع ہوگئی اور کئی ہفتوں تک ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ دونوں ٹیموں کا کچومر نکل گیا ——— ہمارا مطلب ہے فوجوں کا۔

وہ دیکھئے! دونوں امپائر گھوڑوں پر سوار، سفید زرہ بکتر پہنے میدان میں آ رہے ہیں۔ ان کے گھوڑے بڑے تندرست ہیں۔ اور بالکل سفید رنگ کے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بگل ہے جسے وہ فاؤل ہونے پر یا لڑائی روکنے کے لئے بجائیں گے۔

وہ انھوں نے اشارہ کیا۔ اب دونوں فوجوں کے کپتان میدان میں آ رہے ہیں۔ مغل کپتان جس کا نام مرزا بعلبک بیگ ہے ایک لمبا تڑنگا مضبوط ALL - ROUNDER ہے' جسے دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سُرور پیدا ہوتا ہے۔ اِدھر مرہٹوں کا کپتان بالا جی باجی کھڑ کھڑ دیو معابلتہً پستہ قد ہے۔ اس کا رنگ کچھ سیاہی مائل ہے' صحت واجبی سی ہے' مگر سنتے ہیں کہ چُستی اور چالاکی میں کسی سے کم نہیں۔

وہ انھوں نے ڈھال ہوا میں اچھالی اور ٹاس کیا۔ ڈھال سیدھی گری۔ مرہٹے ٹاس جیت گئے۔ ان کا کپتان ناچتا کودتا واپس جا رہا ہے۔ اب مرہٹوں کی ساری فوج بائیں طرف اکٹھی ہو رہی ہے مغل دہنی طرف ہیں۔ مغلوں کے سامنے سُورج ہے' جس سے ان کی آنکھیں لازمی طور پر چندھیا جائیں گی۔ لیکن وہ ٹاس جو ہار چکے ہیں۔

ارے! یہ کیا؟ ۔ ہاں! ۔ امپائروں نے دونوں کپتانوں کو پھر بلایا ہے۔ انھیں سمجھا رہے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے جس سے ناک کٹ جائے یا کان اُڑ جائے۔ لڑتے وقت ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا' آدمیت سے لڑنا' کیونکہ انسانیت ہی اصلی چیز ہے۔ سامعین ہمیں ایک شعر یاد آگیا۔ ہمیں ایسے موقعوں پر اکثر شعر یاد آجاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

آدمیت سے بالا ہے آدمی کا مرتبہ!

پست ہمت یہ نہ ہووے' پست قامت ہو تو ہو

اب دونوں کپتان واپس اپنی اپنی فوجوں میں جا رہے ہیں اور

ہٹوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ مغل کپتان نے اپنی ساری فوج اگلی صفوں میں ٹھونس دی ہے۔ فل بیک دستہ بالکل معمولی سا ہے اور گول کیپر دستہ تو سرے سے غائب ہے۔ پیچھے کوئی سپاہی نظر نہیں آتا۔ عجب تماشا ہے! مرہٹے بالکل برعکس کر رہے ہیں۔ اپنا اپنا طریقہ ہے صاحب!

(مجوب کی آواز)

وہ سنیئے، ڈھول بج رہے ہیں۔ بگل بجایا گیا۔ ایک — دو — تین! — لڑائی شروع ہو گئی!

اس وقت ہماری حالت بھی قابلِ دید ہے، ہمارا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔ آہاہاہا! مغلوں کا سنٹر فارورڈ دستہ تیر کی طرح جا رہا ہے۔ مرہٹوں کے ہاف بیک دستے نے اسے جانے دیا اور ادھر ادھر ہو گئے۔ سامعین! اس میں ضرور کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔ اب وہ فل بیک دستے تک پہنچ گئے ہیں۔ ارے! یہ کیا؟ وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ فل بیک دستہ بجلی کی طرح تڑپا۔ ہاف بیک دستہ واپس پلٹا اور مغل دستہ وہیں دھر لیا گیا۔

امپائر گھبرائے ہوئے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو؟ آج کی جنگ کی لاج ان کے ہاتھ ہے۔ وہ دیکھیئے دو سپاہی باہر نکالے جا رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ ٹھہریئے ہم دریافت کر کے بتاتے ہیں۔

(ایک وقفہ)

بات یہ تھی کہ ایک مغل سپاہی نے ایک مرہٹے کو دھکا مار کر گھوڑے سے گرا دیا تھا۔ مرہٹے نے مغل کی ٹانگ میں کاٹ کھایا۔ مغل حقارت

سے بولا۔ "اُف! اب علاج کے لئے ناحق کسولی جانا پڑے گا۔"
آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ کسولی میں باؤلے کتے کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے۔ اس سے مرہٹے کے لطیف جذبات کو ٹھیس لگی۔ وہ بولا۔ "ٹھہر تو سہی۔ ابھی کہتا ہوں امپائر سے۔" چنانچہ دونوں کو باہر نکال دیا گیا۔

اچھا ہوا، جب تک ایسی سزائیں نہ دی جائیں لڑائی میں گڑبڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ افوہ! دوسرے مغل دستے کا بھی یہی حشر ہوا۔ آخر مغل کوئی اور طریقہ کیوں نہیں استعمال کرتے؟ مرہٹے چپ چاپ اپنی اپنی پوزیشن پر جمے کھڑے رہتے ہیں۔ مغل تیزی سے آتے ہیں۔ یہ کوئی مدافعت پیش نہیں کرتے۔ اور جب ان کا دستہ گول کیپر دستے تک پہنچتا ہے۔ تو سب مرہٹے ٹوٹ پڑتے ہیں اور انہیں دبوچ لیتے ہیں۔ اس قسم کے داؤ سے تو کبڈی ہی اچھی۔ واہ واہ۔ یوں کب تک ہوتا آخر؟ آب و ہوا کا اثر بھی کوئی چیز ہے۔ غذا اور صحت بھی کوئی معنے رکھتی ہے۔ اتنی سی دیر میں مرہٹے تھک گئے۔ بری طرح ہانپ رہے ہیں۔ کئی حضرات اپنے خود اور زرہ بکتر اُتار اُتار کر امپائروں کو دے رہے ہیں۔

وہ امپائروں نے خیمے کی طرف چلا کر کہا۔ "ذرا پانی بھجوانا۔" چنانچہ چند سقے پانی پلانے جا رہے ہیں۔

اب مغلوں کا پلہ بھاری ہے۔ مرہٹوں کی خوب خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ مغل انہیں پچھاڑے ڈالتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹے ورزش نہیں کرتے۔ اگر یہی حال رہا تو لڑائی دیر تک نہیں

چلے گی۔ مغلوں کے پوائنٹس بڑھتے جارہے ہیں۔

(بگل کی آواز)

افوہ! یہ کیا ہونے لگا؟ بادل آگئے، آسمان پر اندھیرا چھا گیا، بجلیاں کوند رہی ہیں۔

(بجلی کے کوندنے کی آواز اور بوندوں کا شور)

یہ دیکھیے بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بگل بجائے گئے اور لڑائی بند ہو گئی۔ موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ اب پھر لوگوں کو سسکیاں آرہی ہیں۔ قدرت مرہٹوں کی مدد کو آپہنچی۔ اتنی دیر میں وہ تازہ دم ہو جائیں گے۔

سارے سپاہی بڑے خیمے کے نیچے کھڑے ہیں۔ غالباً بارش دیر تک نہیں رہے گی۔ لیجیے، اتنی دیر تک آپ ایک ریکارڈ سنیے۔ شاید یہ ییاگی کی ملہار ہے۔

(ریکارڈ بجتا ہے۔ برسن لاگی رے بدریا ساون کی۔ اور اس کے بعد دوسرا ریکارڈ۔ چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے)

(بگل کی آواز)

بارش بند ہو گئی۔ امپائر اور کپتان میدان کا بغور معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ لیجیے انہوں نے میدان کو پاس کر کے فوجوں کو بلا لیا۔ پھر لڑائی شروع ہو گئی۔

مرہٹے بڑے جوش و خروش سے لڑ رہے ہیں اور اس وقت وہ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

چند سپاہی لڑتے لڑتے بالکل ہمارے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں ایک آدھ ہاتھ ہمارے رسید نہ کر دیں۔ آپ ان کی آوازیں سُن سکتے ہیں۔

اوہ! مرہٹے کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مغل نے بڑی سپورٹس مین سپرٹ دکھائی اور ایک طرف ہو گیا۔ اب ان کی آواز سُنیے۔

مرہٹہ: ' مارئیے صاحب! '

مغل: "نہتوں پر حملہ کرنا بہادروں کا شیوہ نہیں"

چنانچہ مرہٹے نے جھک کر کہا: ' شکریہ! اور فوراً نئی تلوار منگائی " اتنی دیر مغل دوسری طرف منہ کئے کھڑا رہا۔ غالباً ضبط کرتا رہا۔ نوکر نئی تلوار لے آیا۔ مرہٹے نے تلوار ہاتھ میں لے کر ادھر اُدھر ہوا میں وار کئے۔ پھر مغل کو اشارہ کیا اور اس کی ڈھال پر تین چار وار کئے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ تلوار مضبوط ہے تو دونوں لڑنے لگے۔ اب وہ لڑتے لڑتے دُور نکل گئے ہیں۔

(بگل کی آواز)

یہ نفیریاں کیوں بج رہی ہیں؟ کہیں سے ڈھول کی آواز بھی آ رہی ہے۔ اخاہ۔ لنچ انٹرول ہو گیا۔ فوجیں کھانا کھانے واپس جا رہی ہیں۔ فی الحال ہم بھی اجازت چاہتے ہیں۔ گھنٹہ بھر آپ کو جنگی ریکارڈ سُنائے جائیں گے۔

(ریکارڈ بجتا ہے۔ چل چل رے نوجوان۔ اس کے بعد — جھانی بچہ گھٹنا نونہالو جاگو۔ اور کئی اور ریکارڈ)

لیجئے اب لنچ انٹرول ختم ہونے کو ہے۔ ہم ابھی خیموں سے آ رہے

ہیں۔ مغلوں نے خوب مرغن غذائیں کھائی ہیں۔ میٹھے ٹکڑے تو وہ اس قدر کھا گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ آخران لوگوں کا ارادہ کیا ہے ؟ لیکن مرہٹوں نے نہ جانے کس پالیسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صرف ذرا ذرا سے چاول پھانک کر صبر کرلیا۔ اب وہ پان کھا رہے ہیں۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ انسان خالی پیٹ اچھا لڑ سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ طبی نقطۂ نگاہ سے بھی جب پیٹ خالی ہو تو دم خم کہاں سے آئے گا ؟ جسمانی قوت کا دارومدار اعلیٰ درجے کی غذا پر ہے اور پھر بزرگوں نے بھی کہا ہے۔ کہ بھوکا بٹیر کیا لڑے گا ؟ ۔ معاف کیجئے ہم خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی ہانک جاتے ہیں۔ اب فوجیں آرہی ہیں، انہوں نے میدان تبدیل کر لئے ہیں۔ مغل پہلے ہماری دہنی طرف تھے۔ اب بائیں طرف آگئے ہیں۔ مرہٹے بھی دوسری طرف چلے گئے۔

(بگل کی آواز)

یہ لیجئے لڑائی شروع ہوگئی۔ لیکن یہ کیا ہو رہا ہے۔ مرہٹے بجلی کی طرح تڑپ رہے ہیں اور مغلوں پر چھاتے جاتے ہیں۔ شاید یہ خالی پیٹ کا اثر ہے۔ اُدھر مغل ہیں کہ بالکل سست پڑ گئے ہیں۔ غالباً پراٹھوں کا خمار چڑھ رہا ہے۔ ابھی ابھی امپائروں نے کئی سوئے ہوئے مغل سپاہیوں کو جگایا ہے۔

یہ مغل کپتان اشارے کیسے کر رہا ہے ؟ اُفوہ! ڈھول والوں کو کر رہا ہے۔ تبھی ڈھول زور زور سے بجنے لگے۔

(ڈھولوں کی آواز)

مغل سپاہی چونک پڑے۔ جو اُونگھ رہے تھے۔ وہ بھی ہشیار ہو گئے اور لڑنے لگے۔ مغل کپتان کی اس دانشمندی کی ہم داد دیتے ہیں۔ اگر وہ ڈھول نہ بجواتا تو غالباً ساری فوج قیلولہ کر رہی ہوتی۔
ارے یہ کیا تماشا ہے؟ بالکل ہمارے قریب ایک نوکر کسی مرہٹہ سپاہی کو بلا رہا ہے۔ اس نے ٹفن کیریر پکڑ رکھا ہے اور اس کے اشاروں پر دو سپاہی لڑتے لڑتے ادھر آ گئے ہیں۔ نوکر ہے کہ بدستور بلا رہا ہے۔ آخر دونوں سپاہی ٹھہر جاتے ہیں۔ آپ ان کا مکالمہ سُنیئے۔

مرہٹہ: کیا ہے؟ ۔ دیکھتا نہیں ہم مصروف ہیں؟
نوکر: 'حضور کھانا۔!'
مرہٹہ: 'بے وقوف! تجھے آداب حرب و ضرب کی الف بے بھی نہیں معلوم۔ ہم جب لڑ رہے ہوں تو کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارا وقت ضائع نہ کر۔!'
مغل: کیا بات ہے بھئی؟'
مرہٹہ: حضور! میں ان کا کھانا لایا ہوں!
مغل: کھانا لائے ہو؟ ۔ اب؟؟ ۔ تو جناب آپ اب تک بھوکے لڑ رہے تھے؟
مرہٹہ: 'جی ہاں! اس نامعقول نے دیر کر دی!'
مغل: 'اوہو! آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں نادم ہوں اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ جائیے کھانا کھائیے۔ میں اتنی دیر انتظار کروں گا!'
مرہٹہ: 'اجی صاحب، آپ بھی ساتھ ہی چلئے!'

مغل: 'میں چلوں؟ — ابھی تو کھانا کھایا تھا۔ خیر! اچھا کیا ساتھ لائے ہو؟؟

نوکر: 'حضور! بہت سی چیزیں ہیں، لیکن خاص چیز میٹھے . . . ٹکڑے ہیں!'

مغل: 'میٹھے ٹکڑے؟ — آہ! کس نے کہا میٹھے ٹکڑے؟ خدایا یہ میں کیا سُن رہا ہوں؟ کیا سچ مچ میٹھے ٹکڑے ہیں۔ چلئے جناب ابھی ساتھ چلتا ہوں!'

ان کا مکالمہ ختم — اب دونوں نوکر کے ساتھ لڑتے ہوئے دُور چلے جاتے ہیں۔ سامعین ہمیں یہاں اختلاف ہے۔ آخر یہ مغل میٹھے ٹکڑوں کو دیکھ کر بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں؟ — مانا کہ اچھی مزیدار چیز ہے، لیکن ایسی بھی نہیں کہ اسی کا ہو ہم ہو جائے۔ ہمیں ایک مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے! ایک مغل دوست کی دعوت میں ہم نے میٹھے ٹکڑے کھالئے اور دیر تک ہمارے پیٹ میں درد ہوتا رہا — !

اب ہم جنگ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مغلوں کے پوائنٹس پھر بڑھتے جا رہے ہیں۔ غالباً مرہٹے تھک گئے ہیں۔ مغل عجب بے نیازی سے لڑ رہے ہیں۔ غالباً انہیں یقین ہو گیا ہے کہ فتح ان کی ہو گی۔ اگر یہ صحیح ہے تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ لڑائی اور امتحان کے نتیجے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

(بگل کی آواز)

یہ غل کیسا مچا؟ — لڑائی بند ہو گئی — اخاہ! انٹرول ہے۔

اب پورے چار بجے ہیں۔ پندرہ منٹ لڑائی بند رہے گی۔ کچھ دیر کے لئے ہم پھر رخصت چاہتے ہیں۔ اتنے میں آپ مرہٹوں اور مغلوں کے فوجی بینڈ سنیئے۔

(ایک وقفہ جس میں بینڈ کے ریکارڈ بجتے ہیں)

یہ لیجیئے، اب جنگ کے منعقد ہونے میں صرف تین منٹ باقی رہ گئے ہیں اور میں مائکروفون دوسرے اناؤنسر کو دیتا ہوں۔

دوسرا اناؤنسر۔ شکریہ! ــــــ

سامعین۔ ہم ایک بہت بڑی خبر سنانے والے ہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہے کہ جہاں مغلوں نے شربت پیا ہے وہاں مرہٹوں نے جی بھر کر تاڑی پی ہے اور بھنگ بھی پی ہے۔ اب وہ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں بھنگ تاڑی اور چرس وغیرہ سے سخت نفرت ہے!۔ مرہٹوں سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ فوجیں پھر میدان میں آگئیں۔

(بگل کی آواز)

یہ لیجیے لڑائی شروع ہوگئی! لیکن لڑ کون رہا ہے؟ سب کے سب قطعاً بیزار ہیں۔ مغل اخروٹ، پستے اور کشمش پھانک رہے ہیں۔ اُدھر مرہٹوں پر تاڑی کا اثر ہے۔ امپائر بڑے پریشان ہیں۔ بے چارے اِدھر اُدھر منتیں کرتے پھر رہے ہیں کہ یار دکچھ تو لڑو۔ وہ لیجئے! تنگ آکر امپائروں نے دھمکی دیدی کہ اگر لڑائی شروع نہ کی گئی تو دونوں ٹیموں یعنی فوجوں کو DISQUALIFY کر دیا جائے گا۔ طوعاً و کرہاً جنگ آہستہ آہستہ پھر شروع ہو رہی ہے لیکن

سپاہی اس طرح لڑ رہے ہیں، جیسے کسی پر احسان کر رہے ہوں۔

اُف! یہ مرہٹے کیا کر رہے ہیں؟ آپس میں ہی لڑ رہے ہیں چند مرہٹے بالکل ہمارے پاس کھڑے ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں غالباً آپ کو صاف سنائی دے رہی ہوں گی — سُنیے۔

'ہمیں کیوں مار رہے ہو؟'

'تو اور کسے ماریں؟'

'اُن کو مارو!'

'اُن کو؟ کن کو؟'

'جن سے لڑنے آئے ہو!'

'لڑنے کس سے آئے ہیں؟'

'پتہ نہیں۔ لیکن ہمیں نہ مارو!'

الغرض ایسی ہی اُلٹی سیدھی باتیں ہر طرف ہو رہی ہیں۔ اب بیس منٹ باقی ہیں۔ وہ دیکھیے مرہٹوں کا کپتان آگے بڑھ کر امپائر سے روشنی کی کمی پر اعتراض کرتا ہے کہ اندھیرا سا ہو گیا ہے اور اچھی طرح لڑا نہیں جاتا، دوست دشمن میں تمیز مشکل ہے۔

امپائر آپس میں مشورہ کرتے ہیں، پھر مغلوں کے کپتان سے پوچھتے ہیں۔ بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

(ڈھول بجتے ہیں)

ڈھول بجائے جا رہے ہیں۔ لڑائی ختم! نتیجے کے لیے لوگ بے قرار ہیں۔ سارے سپاہی میدان میں جمع ہیں۔ ہم خود منتظر

ہیں! ہمارا خیال ہے کہ مغل جیتیں گے۔

اے لو وہ فیصلہ سنا دیا گیا۔ لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

(شور و غل)

اس غل غپاڑے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اخاہ! یہ! کیا سن رہے ہیں؟ برابر رہے! سنا آپ نے؟ — دونوں فوجیں برابر رہیں! مغلوں اور مرہٹوں کے پوائنٹس بالکل برابر ہیں۔ پہلی مرتبہ اس قسم کا فیصلہ ہوا ہے۔ ویسے بابر میموریل شیلڈ رہے گی مغلوں کے پاس ہی، کیونکہ انہوں نے پچھلے سال جیتی تھی۔

سب سپاہی ایک دوسرے کے کندھے تھپتھپا رہے ہیں۔ چند شوقین حضرات آٹوگراف لیتے پھر رہے ہیں۔ ہم مائیکروفون کو عین میدان کے بیچ لیے چلتے ہیں۔

(آواز آتی ہے)

تھری چیرز فار مغلز۔ ہپ ہپ ہپ ہرے!

ہپ ہپ ہپ ہرے!

تھری چیرز فار مرہٹاز۔ ہپ ہپ ہپ ہرے!

ہپ ہپ ہپ ہرے!

(آوازیں مدھم ہوتی ہیں)

(FADE OUT)

۲۔ عاشق

خواتین و حضرات! شام کے سات بج کر پچپن منٹ ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے بلبلوں کی لڑائی سنی۔ کچھ دیر میں ہم جیتے جاگتے عاشق

کو براڈ کاسٹ کریں گے۔ پچھلے مہینے ہمیں بے شمار شکایتیں آئیں کہ ریڈیو کا پروگرام خشک ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اس کی تلافی کر رہے ہیں۔ جن صاحب نے ہمیں یہ مشورے دیئے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نہیں جانتے کہ ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور صحیح قسم کے عاشق کی تلاش میں کتنے دنوں مارے مارے پھرے۔ عاشق تو بہت ملتے تھے، لیکن آئیڈیل عاشق نہیں ملتا تھا۔ پرسوں قسمت نے یاوری کی اور ہم نے اسے پالیا۔ اب ہم آپ کو کسی شہر کے کسی گوشے کی کوٹھی میں لئے چلتے ہیں۔ کل ہم اس عاشق کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے۔ آج چپکے سے اسے براڈ کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود پتہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم اپنی اس حرکت پر پشیمان ہیں، لیکن اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ لیجئے، اب اصل پروگرام شروع ہوتا ہے۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں اور ٹکٹکی باندھے عاشق کو دیکھ رہے ہیں جو اس وقت باغ میں ٹہل رہا ہے۔ عاشق کا حلیہ ہم ہرگز نہیں بتائیں گے۔ ویسے بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے، پبلک عاشق کا حلیہ جانتی ہے۔ تو سامعین اس عاشق نے اپنے محبوب کو کبھی نہیں دیکھا۔ فقط اس کی تعریفیں سنی ہیں۔ بس سُن سُن کر ہی فریفتہ ہو گیا ہے، اور ہونا بھی یونہی چاہیئے۔

ابھی ابھی ایک ناصح یہاں سے بُرا منہ بنائے گیا ہے۔ عاشق کے بزرگوں نے چند PART TIME ناصح رکھے ہوئے ہیں جن کا فرض

دن میں دو تین مرتبہ سمجھانے بجھانا ہے ، لیکن عاشق ان سے بڑی طرح پیش آتا ہے اور ہمیشہ انھیں بھگا دیتا ہے اور اکثر شعر پڑھنے لگتا ہے۔ ابھی ابھی اس نے ناصح کو ڈانٹتے ہوئے ایک شعر پڑھا تھا جو ہمیں یاد ہے۔ شعر سُن کر ہمارا دل تڑپ اٹھا تھا۔ آپ بھی سُن لیجئے۔ اس نے کہا تھا ؎

اب ضرورت ہے ہم کو عینک کی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آہ کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ کتنا درد ہے اس مصرعے میں ؟ یوں تو عاشق ہر وقت کوئی نہ کوئی شعر گنگناتا رہتا ہے ، لیکن اس کے محبوب شعر صرف چند ایک ہیں ملاحظہ ہو ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ ذائقہ کیا ہے

اور دوسرا شعر ہے ؎

اپنی تصویر سامنے رکھ کر
تیرا انجام سوچتا ہوں

سبحان اللہ — تیرا انجام سوچتا ہوں میں ۔ کیا سوز مضمر ہے اس میں ۔ ایک اور شعر ہے جو وہ عموماً آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر گایا کرتا ہے ؎

اپنی صورت کو دیکھتا ہوں میں
اس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں

عاشق نے پیٹ کے بل لیٹ کر چار آہیں بھریں ، اب اس نے

کروٹ لی اور پانچ ٹھنڈے سانس لیے۔ اب وہ سیدھا لیٹ کر چاند کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا ہے۔

اے لو! وہ لپک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر کاغذات پڑے ہیں۔ عاشق کیا شاعری کر رہا ہے؟ — نہیں! — اُف! یہ تو تارے گن رہا ہے۔ آسمان کو دیکھتا ہے اور کاغذ پہ پرکار وغیرہ سے نقشہ بنانے لگتا ہے۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ عاشق علم ریاضی میں ماہر ہے۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ عاشق نے نامہ بر کے ہاتھ ایک پنسل بھیجی تھی کہ محبوبہ کے ہاتھ سے کسی طرح چھوا لائے۔ پھر ایک رومال بھیجا کہ محبوبہ اس پر چھینک دے، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

سامعین! آپ افسردہ نہ ہوں۔ سچی محبت میں ایسی باتیں اکثر ہوا کرتی ہیں۔ دنیا میں رنج و الم نسبتاً زیادہ ہیں۔

یہ کون مسخرہ آرہا ہے؟ — اوہ! یہ چارہ گر ہے۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کا سیٹ ہے۔ اگر عاشق چائے نہ پیے تو اس کا سٹیمنا ختم ہو جائے۔ عاشق نے جلد چائے پی۔ چائے دانی کو ایک پتھر پر دے مارا، پیالیاں اِدھر اُدھر پھینک دیں۔ چھلانگیں مارتا ہوا بھاگا اور گھاس کے ایک قطعے پر لیٹ کر محبوبہ کو یاد کرنے لگا۔

اتوار کے روز ریگستان کا پروگرام ہوتا ہے۔ عاشق ایک چھوٹی سی ٹوکری میں کھانے پینے کی چیزیں، تھرماس اور چند دیوان ساتھ لے جاتا ہے وہاں صبح سے شام تک ٹیلوں پر بھاگنا، فرضی اونٹوں کا تعاقب کرنا، دھول اُڑانا، کانٹوں پر ننگے پاؤں پھرنا اور آہ و زاری

وغیرہ کرنے کا پروگرام ہوتا ہے۔

وہ اس نے منہ میں تھرما میٹر لگایا اور گھڑی نکال کر نبض گننا شروع کی۔ تھرما میٹر پڑھا، کاغذ پر ٹمپریچر لکھا اور نبض درج کی۔ یہ اس لیے کہ اس سے گرمیِ عشق کا اندازہ رہتا ہے۔ اگر ٹمپریچر یا نبض گر جائے تو ظاہر ہے کہ عشق کا جذبہ سرد ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب کبھی یوں ہونے لگتا ہے تو عاشق دگنے جوش سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

سامعین! ہم نے یہ چارٹ دیکھا تھا، عاشق کا ٹمپریچر ایک سو ایک اور نبض ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی ہے۔ ویسے آج صبح بھی ٹمپریچر زیادہ تھا۔ شاید اس لیے کہ آج عاشق کو زکام ہے اور وہ کچھ بیزار بھی ہے۔

عاشق کے کمرے میں ایک گراموفون ہے اور بے شمار ریکارڈ ہیں۔ نوکر ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک ریکارڈ لگا دیتا ہے۔ خواہ عاشق باغ میں ہو یا چھت پر۔

چنانچہ اگر آپ اب بھی کانوں پر زور ڈالیں تو مدھم آواز میں ایک ریکارڈ سنیں گے (آواز آتی ہے) ع

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ

اس کے محبوب ترین ریکارڈ یہ ہیں:۔

'ہم تو تنگ آ کے دنیا سے مر جائیں گے'

'کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو'

'تیرے جہاں سے چلے دل میں دل کی بات لیے'

ان ریکارڈوں کے نمبر ہیں۔ تین ہزار، پانچ سو سترہ سے بیس تک اور یہ آپ کو نیلے گنبد کی دکان سے مل سکتے ہیں۔

عاشق ایک دوبجے کے قریب بستر پر لیٹ جائے گا جس پر بے شمار سلوٹیں پڑی ہوں گی، اور ساری رات آہ وزاری میں گزارے گا۔ خوب کروٹیں لے گا اور شاید ایک دو مرتبہ پلنگ سے نیچے بھی گر پڑے گا۔ پھر صبح صبح اٹھ کر بھاگتا ہوا دریا کے کنارے جائے گا۔ وہاں پانی کی لہروں سے دل کے راز کہے گا۔ دن بھر تک جنگلوں میں پھرے گا۔ شام کو غروب آفتاب دیکھنے ایک مینار پر چڑھ جائے گا۔ چاندنی راتوں میں عاشق کی صحت بہت گر جاتی ہے۔ جب بارش ہو رہی ہو تو اس کی حالت خدوش ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ترس آنے لگتا ہے اس کی آہ وزاری سے تنگ آکر اڑوس پڑوس کے تمام ہمسائے مکان خالی کر گئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو دیکھا دیکھی عاشق بن گئے۔

چار مہینوں سے عاشق نے سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ تبھی اس کی جیبوں میں اکثر خشک میوے ملتے ہیں۔ آج کل اس کا گزارا حلوہ پر ہے۔

اچھا سامعین! اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ ایک ننھی سی چڑیا ہمارے کان میں کہتی ہے کہ یہ عاشق اس وقت کیا کرے گا جب اپنی محبوبہ کو سچ مچ دیکھ پائے گا۔ نہ تو ہم نجومی ہیں، نہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ!

۳ — مزدور

کچھ دن ہوئے ہم نے ہوا کی لہروں پر چند شخصیتوں کا انٹرویو پیش کیا تھا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ ضرور مقبول ہوا ہوگا، آج مزدور سے انٹرویو ہو رہا ہے۔

سامعین! کبھی آپ نے اس شخص پر بھی غور کیا جسے مزدور کہا جاتا ہے؟ غالباً نہیں! کتنے افسوس کی بات ہے۔ مزدور کے سینے میں بھی دل ہے۔ اور اتفاق سے وہ دھڑکتا بھی ہے، اس میں جذبہ ہے، احساس ہے، تڑپ ہے۔

آج ہم زمانے بھر کی دکھیا اور سماج کی ستائی ہوئی روح کی پکار آپ کے کانوں تک پہنچائیں گے۔ سامعین! ہم نہیں چاہتے کہ کمزور دل خواتین و بچے اسے سنیں، کیونکہ یہ داستان اس قدر پُر درد ہے کہ ابھی سے ہماری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ ننھے منے بچوں اور خواتین کو ریڈیو سے ہٹا دیا جائے۔

مزدور سے ملک کی تین مقتدر ہستیاں انٹرویو کریں گی۔ پہلے جناب نقشین مرادآبادی آئیں گے جو مایۂ ناز قومی شاعر ہیں۔ پھر حضرتِ آوارہ گرد صاحب جو ہندوستان کے چوٹی کے ترقی پسند افسانہ نویس ہیں۔ آخر میں پنڈت چرطی کرار لکھنوی تشریف لائیں گے، جن کے متعلق کچھ کہنا ان کی اور اپنی توہین ہے۔ ہم فقط یہ کہیں گے کہ آج کل کوئی سیاسیات پر قادر ہے تو وہ پنڈت صاحب ہیں۔

یہ لیجیے مزدور کمرے میں آ گیا۔ سلام کر دو مائیکروفون کو بھی مزدور۔ ہاں ہاں۔ شاباش۔ سامعین مزدور کا سلام شوق قبول ہو۔ وہ لیجیے نقشین مرادآبادی بھی تشریف لے آئے۔ اب مکالمے آپ خود سنیئے!

(شاعر کی آواز آتی ہے۔ "آ۔ اے غم دیدہ، خمیدہ روح کی پکار۔ مصیبت میں گرفتار۔ اے سماج کے شکار۔ تو ہے اپنی شکست... کی آواز۔ بول۔ اے زمانے بھر کے ٹھکرائے ہوئے۔ سرمایہ داری

کے ستائے ہوئے۔ اور پھرتا کیوں ہے تو در بدر ہاتھ پھیلائے ہوئے؟

مزدور۔ "ایں؟"

شاعر: "سر سے لے کر پاؤں تک سُستی سی کچھ چھائی ہوئی۔ اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی۔ نہیں نہیں یوں نہیں۔ بلکہ اس طرح۔ سر سے لے کر پاؤں تک سُستی سی کچھ آئی ہوئی۔ اُف یہ تیری رُوح پر بیزاری سی چھائی ہوئی۔ اب ٹھیک ہے! بول اے فخرِ احمقاں۔ ننگ خانداں۔ سیدھے سادے دہقاں۔ بھولے بھالے انساں"۔ بول!"

مزدور۔ "جناب کم از کم گالیاں تو نہ دیجیے۔!"

شاعر۔ آہ ناداں! انہیں گالیاں سمجھتا ہے۔ آہ ناداں۔ اُف ناداں۔ ہائے ناداں ؎

"تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے"

مزدور:۔ "جناب کسی آسان سی زبان میں باتیں کیجیے۔ میرے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا!"

شاعر: "تمہارے ابا کیا... کرتے تھے؟"

مزدور:۔ "مزدور تھے!"

شاعر: "اور دادا!"

مزدور: "مزدور!"

شاعر: "اور بیٹا؟"

مزدور: "وہ بھی مزدور ہے!"

شاعر:- سبحان اللہ! تمہارا خاندان ہی مزدوروں کا ہے۔ میں تو مزدوروں پر جان چھڑکتا ہوں۔ ہمارا سب خاندان مزدوروں پر مر مٹتا ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟- مر مٹتا ہے! ہاں ایک شعر عرض ہے۔

تیرے سب خاندان پر عاشق

میرا سب خاندان ہے پیارے

مزدور:- "کیا کہا؟- پھر سے کہنا ذرا- دیکھئے صاحب میں۔"

شاعر: بس بس! ہشت! اچھا- کبھی وہ شعر بھی سُنا؟

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

سُنا ہے کبھی یہ شعر؟"

مزدور: "نہیں سُنا!"

شاعر: "اور جب رات کی سیاہی رخصت ہوتی ہے اور صبح کا نور آسمان سے زمین تک لہریں مارتا ہے تو اس وقت تم کیا کرتے ہو؟"

مزدور: "کیا فرمایا آپ نے؟"

شاعر: "یعنی صبح کو کیا کرتے ہو؟"

مزدور: "میں ورزش کرتا ہوں صبح اُٹھ کر!"

شاعر: ورزش؟- بیچ بیچ- اور جب آفتاب عین نصف النہار پر ہوتا ہے اور زمین پر اپنی تیز کرنیں پھینکنے سے باز نہیں آتا۔ دوپہر کی چلچلاتی دُھوپ میں کن مشقتوں سے دوچار ہوتے ہو؟"

مزدور: "کھانا کھا کر سو جایا کرتا ہوں!"

شاعر: "اور جب شام کے دلفریب لمحے دن بھر کے تھکے ماندوں

مسرت کا پیغام سناتے ہیں، اس وقت کس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہوئے

مزدور: "اکھاڑے میں ورزش کرتا ہوں!"

شاعر: "ورزش! ورزش!! ہم بھی ورزش کرتے ہیں، لیکن ڈینگیں نہیں مارتے تمہاری طرح! صبح اٹھ کر ہم وو ڈمنٹ پیلتے ہیں، پانچ بیٹھکیں نکالتے ہیں اور پندرہ مرتبہ لمبے لمبے سانس لیتے ہیں. شام کو ہم پچاس قدم تیزی سے چلتے ہیں!"

اناؤنسر: "ہمیں افسوس ہے، نقشین صاحب نے اتنی دیر بھی لگائی اور ایک بات بھی کام کی نہ کی. خفا نہ ہوں نقشین صاحب! ہم بات خدا لگتی کہتے ہیں.

آہا ہمیں ایک شعر یاد آگیا

بات سچی ہے بے مزا لگتی

میں کہوں گا مگر خدا لگتی!

اچھا! آوارہ گرد صاحب! اب آپ تشریف لے آیئے. آوارہ گرد صاحب کے افسانے محض مزدوروں کے متعلق ہوتے ہیں - یہ مزدوروں کی رگ رگ سے واقف ہیں. اور مزدوران کی رگ رگ سے. لیکن آوارہ گرد صاحب! یاد رہے کہ سوالات نپے تلے ہوں، مختصر ہوں، اور بامعنے ہوں. ادھر آجایئے. یہ لیجئے اب آپ خود سنیئے!"

آوارہ گرد: "بھئی مزدور! جب تم کسی امیر آدمی کو دیکھتے ہو گے تو تمہارا خون ضرور کھولنے لگتا ہو گا؟"

مزدور: "نہیں تو!"

ادیب: "نہیں؟ غضب خدا کا! اور جب تم کسی خوش پوش شخص

تو موٹر میں دیکھتے ہو تو سماج پر لعنت ملامت نہیں بھیجتے؟"

مزدور: "سماج کیا ہوتا ہے۔ اور میں کبھی کسی کو گالی نہیں دیتا۔ یہ بہت بری بات ہے!"

ادیب: "تمہیں خیال تو آتا ہوگا کہ یہ شخص موٹر میں کیوں بیٹھا ہے۔!"

مزدور: اوہوں! وہ تو ٹھیک ہے لیکن آخر کیوں ہے اس کے پاس موٹر؟"

مزدور: "اس نے موٹر خریدی جو ہے!"

ادیب: "تم سرمایہ داری کی اس لعنت پر نفرت کی بوچھاڑ ڈالتے ہوئے مساوی حقوق کے لئے کوشاں ہونا اپنا فرضِ اولین تصور نہیں کرتے؟"

مزدور: "قسم لے لو جو ایک لفظ بھی سمجھ میں آیا ہو، ابھی وہ دُبلے پتلے سے آدمی بھی ایسے ہی باتیں کر رہے تھے!"

ادیب: "مثلاً تم یہ نہیں سوچتے کہ آخر امیر، امیر کیوں ہیں اور غریب غریب کیوں ہیں؟ سارے امیر غریب کیوں نہیں بن جاتے، اور غریب امیر کیوں نہیں ہو جاتے؟ تاکہ جو غریب غربت میں غریبی کے متعلق غریبانہ۔!"

اناؤنسر: "آوارہ گرد صاحب! افسوس ہے کہ ہم آپ کو ٹوک رہے ہیں۔ بھلا آپ غریبی کی گردان کیوں کر رہے ہیں؟"

ادیب: "اوہ! معاف کیجئے! ہاں بھئی مزدور تم امیر آدمیوں سے دل ہی دل میں دشمنی ضرور رکھتے ہوگے!"

مزدور: "نہیں! دل میں کبھی کسی سے دشمنی نہیں رکھنی چاہیئے۔ دل صاف ہو تو اچھا ہے ۔۔۔ اور پھر سارے انسان برابر ہیں!"

ادیب: "تم عجیب و غریب مزدور ہو۔ نہ تم سماج کے خلاف ہو، نہ سرمایہ داری کو برا کہتے ہو۔ امیروں سے بھی نفرت نہیں کرتے۔ تعجب ہے۔ اب کیا خاک پوچھوں تم سے؟"

اناؤنسر: اچھا آوارہ گرد صاحب! آپ کا انٹرویو ختم ہوا۔ اب پنڈت چرچڑی لڑا واصاحب آرہے ہیں۔ آخر میں مزدور چند الفاظ میں اپنی دردبھری داستان سنائے گا۔ سامعین! ہم ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ اگر کمزور دل خواتین یا بچے ریڈیو سن رہے ہیں تو انھیں براہ کرم دوسرے کمرے میں بھیج دیا جائے مزدور کی کہانی اس کی اپنی زبانی اتنی غمناک ہوگی کہ پنڈت صاحب نے ابھی سے رونا شروع کر دیا ہے۔ آجائیے پنڈت صاحب! روئیے مت! آپ کی صحت پر برا اثر پڑے گا اور بھئی مزدور یہ تم چلغوزے وغیرہ بعد میں چبا لینا، عجب بے صبرے آدمی ہو تم بھی۔ پنڈت جی تمہاری حالت پر رو رہے ہیں اور تم ہو کہ منہ چلا رہے ہو۔۔۔ تو سامعین سُنیئے!"

پنڈت جی: (گرجتی ہوئی آواز میں رُک رُک کر) "اے ہندوستانی قومیت کے پرستار۔ ہم تجھے سلام کرتے ہیں!"

مزدور: "وعلیکم السلام!"

اناؤنسر: "ہشت!"

پنڈت جی: "ہاں! اے ہندوستانی قومیت کے پرستار، ہم تجھے سلام کرتے ہیں۔ اے ہندوستانی تہذیب کے علمبردار!"

مزدور: "میں نمبردار نہیں ہوں۔ میں تو۔!"

پنڈت جی: "مت ٹوک مجھے۔ یہ لفظ نمبردار نہیں تھا بلکہ علمبردار تھا۔ آہ! تمہارے بھولے پن نے میرے دل پر رقت طاری کر دی۔ میرے قلب میں انتشار پیدا کر دیا۔ تمہارے دل میں ایک انقلاب کی خواہش کروٹیں نہیں لیتی کیا؟ کبھی تمہارے سینے میں گدگدیاں نہیں اٹھتیں۔ نہیں اٹھتیں کیا؟"

مزدور: جناب سینے میں نہیں گدگدیاں تو پیٹ میں ہوا کرتی ہیں!"

پنڈت جی: "اُف ان گدگدیوں کا ذکر کون مسخرہ کر رہا ہے؟ میں دل کی گدگدیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ وارداتِ قلب کا ذکر ہو رہا ہے۔ میرے بھولے بھالے کامریڈ تم مزدور انقلاب چاہتے ہو گے۔ ہم خود انقلاب چاہتے تھے، چاہتے رہے ہیں۔ چاہتے ہیں، چاہیں گے۔ اور چاہتے رہا کریں گے۔ اور اس انقلاب میں ہم تمہیں لڑائیں گے۔ آہ! مزدور لڑیں گے اور ہم تماشا دیکھیں گے۔ فضاؤں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ دل سہم جائیں گے۔ اناؤنسر صاحب ذرا ایک گلاس پانی منگا دیجیے۔ ہاں! انقلاب چاہتے ہو نا۔ سچ سچ بتاؤ؟"

مزدور: "نہیں جناب میں بے قصور ہوں، بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے کبھی ایسی خطرناک باتیں نہیں سوچیں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

پنڈت جی: "پھر وہی بھولپن دکھا رہے ہو میرے جگری دوست۔ میں تمہارے راز سے واقف ہوں۔ سمجھو لو کہ۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے!"

مزدور: (گھبرا کر) "صاحب آپ میری تلاشی لے لیجیے۔ میں نے کچھ

نہیں کیا!"

پنڈت جی: "مجھے ہنسنے کی اجازت دو۔ ہا ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو۔ کامریڈ۔ کس قدر سادہ لوح ہو تم۔ اور جب وہ انقلاب آ جائے گا تو پھر ہماری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ موجودہ کساد بازاری ختم ہو جائے گی مسرت و شادمانی کی لہر ملک کے گوشے گوشے میں دوڑ جائے گی۔ یا تو سب باشندے غریب ہی ہوں گے یا سب کے سب امیر ہوں گے۔ اور یا یہاں باشندے ہوں گے ہی نہیں۔!"

اناؤنسر: "یہ لیجیے پانی کا گلاس۔ پنڈت جی گستاخی معاف، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

پنڈت جی: "اوہ۔ وہ شعر سُنے ہیں آپ نے؟

اکثر بہک جاتا ہوں میں   منہ آئی بک جاتا ہوں میں

ایسا شرابی ہو گیا   عقل و خرد کو کھو گیا

مجھ کو زمانے سے غرض   پینے پلانے سے غرض

آہ!۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟"

اناؤنسر: "اُف پنڈت جی خدا کے لیے بے ہوش مت ہوئیے!"

پنڈت جی: "آئے ہائے! اناؤنسر صاحب رہا نہیں جاتا۔ کیا کروں؟"

اناؤنسر: "صبر سے کام لیجیے۔ خدا کے لیے پنڈت جی!"

(دھڑام سے کوئی گرتا ہے)

اناؤنسر: "سُنا آپ نے، پنڈت جی چرچل لڑاوا صاحب کیا تو ابھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور کیا بے ہوش ہو گئے ہیں۔ زندگی کا کیا اعتبار ہمیں ایک شعر یاد آیا ہے، لیکن غالباً یہ شعر سنانے

کا موقع نہیں۔ اس لئے رہنے دیتے ہیں۔ ابھی ایک ڈاکٹر بلایا ہے خاطر جمع رکھئے، پنڈت جی کو ایسے دورے اکثر پڑا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو ملک کے صدمے سہہ سہہ کر دل بالکل چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ بعض اوقات تو ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ پنڈت جی کا دل سوچ بچار میں گھس گھس کر غائب ہو چکا ہے۔ لو بھئی مزدور، تم اپنی تقریر شروع کر دو۔ ادھر آؤ۔ اس طرف۔ ہاں ہاں۔ شرماؤ نہیں۔ اپنی زندگی کی ناکامیوں پر روشنی ڈالو۔۔ !"

مزدور: "جناب! میں ایک تندرست آدمی ہوں۔ صبح کو ورزش کرتا ہوں اور شام کو بھی۔ اور اچھی خاصی غذا کھاتا ہوں۔ پھر جی بھر کر سوتا ہوں۔ اکھاڑے میں بھی جاتا ہوں اور اچھے اچھے پٹھوں کو پچھاڑ لیتا ہوں۔ پانچ چھ گھنٹے مزدوری کرتا ہوں۔ دن بھر کے لئے کافی مل جاتا ہے، بلکہ کچھ بچ ہی جاتا ہے۔ یہ عجیب سے لوگ مجھے بہلا کر یہاں لے آئے ہیں اور عجیب عجیب باتیں پوچھ رہے ہیں۔ میں ناشکرا نہیں، نہ میں کسی امیری پر واکرتا ہوں نہ نمبرداری کی۔ نہ میں کسی کو برا بھلا کہتا ہوں۔ میری صحت ایسی ہے کہ جتنے آدمی یہاں بیٹھے ہیں ان سب کو گرا سکتا ہوں۔ مجھے بولنے دیجئے۔ یہ دیکھئے ان لوگوں نے دھینگا مشتی شروع کر دی ہے۔ ارے۔ ذرا۔ !"

اناؤنسر: "حضرات سامعین! ہمیں معاف فرمائیے ہم نادم ہیں۔ اس مزدور نے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ پروگرام بالکل خراب ہو گیا۔ حضرت لغشیں مراد آبادی نے سوال کلام کے نہیں کیے۔ آوارہ گرد صاحب چڑ گئے، پنڈت جی بے ہوش ہو گئے اور یہ مزدور کشتی لڑنے کو تیار ہے۔

ہم شرمندہ ہیں۔ اچھا۔ اب ہم قبل از وقت یہ فیچر ختم کرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس کی تلافی عنقریب کر دی جائے گی۔ جب ہم بقیہ مشورے پیش کریں گے۔ ان کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

ایک۔ قدرتی نظارہ

پکنک

ایک اوپریشن

ایک خفیہ جلسہ

اور ایک آدھ صحیح قسم کا انٹرویو بھی کرا دیں گے۔ اچھا۔ آداب عرض!"

شیطان

اس رات اتفاق سے میں نے شیطان کو خواب میں دیکھ لیا۔ خواہ مخواہ خواب نظر آگیا۔ رات کو اچھا بھلا سویا تھا۔ نہ شیطان کے متعلق کچھ سوچا نہ کوئی ذکر ہوا۔ نہ جانے کیوں ساری رات شیطان سے باتیں ہوتی رہیں اور شیطان نے خود اپنا تعارف نہیں کرایا۔ کہ خاکسار کو شیطان کہتے ہیں۔ یہ فقط ذہنی تصور تھی جس سے خبر ہوا کہ یہ شیطان ہے۔ چھوٹے چھوٹے نوک دار کان، ذرا ذرا سے سینگ دُبلا پتلا۔ بانس جیسا لمبا قد۔ ایک لمبی دُم جس کی نوک تیر کی طرح تیز تھی۔ دُم کا سرا شیطان کے ہاتھ میں تھا۔ میں ڈرتا ہی رہا کہ کہیں یہ چبھو نہ دے۔ نرالی بات یہ تھی کہ شیطان نے عینک لگا رکھی تھی۔ رات بھر ہم دونوں نہ جانے کس کس موضوع پر بحث کرتے رہے۔

اب صبح چائے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ رفیق کی شکل بالکل شیطان سے ملتی تھی۔ شکل کیا حرکتیں

بھی وہی تھیں۔ ویسا ہی قد، وہی چھوٹا سا چہرہ، لمبی گردن، ویسی ہی عینک وہی مکار سی مسکراہٹ۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ چپکے سے رضیہ کے کان میں کہہ دیا۔ کہ روقی شیطان سے ملتے ہیں۔ وہ بولی۔ آپ کو کیا پتہ؟ کہا کہ ابھی ابھی تو میں نے اصلی شیطان کو خواب میں دیکھا ہے۔ حکومت آپا رضیہ کے ساتھ بیٹھی تھیں انہوں نے جو ہمیں سرگوشی کرتے دیکھا تو لگیں بے قابو ہو گئیں۔ فوراً پوچھا۔ کیا ہے؟ ۔۔۔ رضیہ نے بتا دیا۔ حکومت آپا کو تو ایسا موقع خدا دے۔ بس میز کے گرد جو جو بیٹھا تھا اسے معلوم ہو گیا کہ روقی کا نیا نام رکھا جا رہا ہے۔ لیکن محض خواب دیکھنے پر تو نام نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ویسے روقی نے ہمیں تنگ بہت کر رکھا تھا۔ بچوں تک کی خواہش تھی کہ ان کا نام رکھا جائے۔

ہم چائے ختم کرنے والے تھے۔ مجھے دوسرے آملیٹ کا انتظار تھا اور رضیہ کو پتہ نہیں کس چیز کا۔ کالج میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا، اس لئے مزے مزے سے ناشتہ کر رہے تھے۔ اتنے میں ننھا حامد بھاگا بھاگا آیا۔ اس کے سکول کا وقت ہو گیا تھا اس لئے جلدی میں تھا۔ وہ روقی کے برابر بیٹھ گیا۔ حامد کو بخار ہو گیا تھا تبھی اس کی حجامت ذرا باریک کروائی گئی تھی۔ روقی نے بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے حامد کے سر کو دیکھا۔ جونہی حامد نے توسٹ کھانا شروع کیا، روقی نے ایک ہلکا سا تھپڑ حامد کے سر پر جما دیا۔ اور میں نے فوراً رضیہ سے کہہ دیا کہ سچ مچ روقی شیطان ہی ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی ننگے سر کھائے تو شیطان دھول مارتا ہے۔ حکومت آپا چونک

کر ہماری جانب متوجہ ہوئیں۔ ان کو پتہ چلنا تھا کہ سارے کنبے کو معلوم ہو گیا کہ آج سے روفی شیطان کہلائے جائیں گے۔

یہ تھا وہ واقعہ جس کے بعد روفی شیطان مشہور ہو گئے۔ چند ہی دنوں میں ہر ایک کی زبان پر یہ نام چڑھ گیا۔ یہاں تک کہ خود روفی نے اس نام کو بہت پسند کیا۔

روفی اور میں بچپن کے دوست تھے اور مجھے اُن کی سب کہانیاں یاد تھیں۔

جب ہم بالکل چھوٹے چھوٹے تھے تو ایک دن روفی کو ان کی نانی جان تاریخ پڑھا رہی تھیں۔ جب پتھر اور دھات کے زمانے کا ذکر آیا تو روفی پوچھنے لگے۔ "نانی جان آپ پتھر کے زمانے میں کتنی بڑی تھیں؟" پھر کہیں سقراط اور بقراط کا ذکر ہوا۔ یہ بولے۔ "نانی جان سقراط اور بقراط کیسے تھے؟"

"کیا مطلب؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے تو دیکھے ہوں گے" جواب ملا۔

ہر وقت روفی کو کچھ نہ کچھ سوجھتی رہتی تھی۔ ہمارے سکول کے سامنے چوک تھی اس پر بے شمار گھوڑے گزرا کرتے تھے (مع سوار و بگھی) کوئی سوار مزے سے جا رہا ہے۔ یکایک روفی چلاتے "جناب! سنیے ذرا۔ گھوڑے کی دم گر گئی ہے۔ اٹھا لیجئے۔ ورنہ گھوڑا اللہ دو را

رہ جائے گا۔" اور سوار فوراً چونک کر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ خاص طور پر گھوڑے کی دُم کو تو ضرور چیک کرتا۔

ایک دن روقی کلاس میں طوطا لے آئے۔ پوچھا یہ کیا؟ بولے۔ "ابھی پچھلے مہینے میں نے پڑھا ہے کہ طوطا سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ میں نے سوچا سُنی سنائی کا کیا اعتبار، خود تجربہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

استاد صاحبان سے تو ہمیشہ نوک جھونک رہتی تھی۔ ایک روز ماسٹر صاحب نے چہل قدمی کے معنے پوچھے۔ کسی کو بھی نہ آئے۔ روقی اُٹھ کر بولے۔ "دو مرتبہ بیس قدمی۔" انہوں نے وضاحت چاہی۔ روقی بولے۔ "جناب! چہل کے معنی ہیں چالیس اور چالیس قدمی سے دو مرتبہ بیس قدمی کہیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ ٹہلتے ہوئے انسان آگے جاتا ہے اور پھر واپس آتا ہے۔"

جغرافیے کے ماسٹر صاحب نے ایک دن روقی سے پوچھا۔ "اگر تم مشرق کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ پھیلا دو، تو تمہارے بائیں ہاتھ پر کیا ہو گا؟"

روقی نے بڑی مسمسی شکل بنا کر کہا۔ "انگلیاں۔"

حساب میں تو بالکل پھسڈی تھے۔ سوال پوچھا جا رہا ہے روپوں کے متعلق اور جواب نکلتا ہے مہینوں میں۔ اسی طرح مہینوں کا جواب سیر دیں چھٹانکوں میں نکل رہا ہے۔ حساب کے ماسٹر ڈانٹتے تو روقی کہتے۔ "جناب میں کیا کروں؟ یہ کمبخت جواب اسی طرح آیا ہے۔" اور جب مزدوری اور وقت کے سوال نکالتے تو جواب

آتا ہے ۳ لڑکے۔ یا ۱۹ عورتیں۔ اس پر ماسٹر صاحب بہت خفا ہوتے۔ ایک روز روفی نے جواب نکالا ½ عورت۔ ماسٹر صاحب چنگھاڑ کر بولے۔ "نالائق! ½ عورت بھی کبھی دیکھی ہے آج تک؟" یہ سر کھجا کر بولے۔ "جناب کوئی لڑکی ہو گی۔"

لیکن جب ہماری جماعت میں انسپکٹر صاحب معائنہ کرنے آئے تو وہ روفی سے بہت خوش ہوئے اور انعام دے کر گئے۔ انہوں نے پوچھا: "اگر پانی کو ٹھنڈا کیا جائے تو کیا بن جائے گا؟" ہم نے سوچا کہ روفی کہہ دیں گے کہ برف بن جائے گا۔

روفی نے پوچھا۔ "کتنا ٹھنڈا کیا جائے؟"

وہ بولے۔ "بہت ٹھنڈا کیا جائے۔"

روفی سوچ کر بولے۔ "تو وہ بہت ٹھنڈا ہو جائے گا۔" بہت پر زور دے کر۔

"اگر اور بھی ٹھنڈا کیا جائے؟"

"تو پھر وہ اور بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" روفی بولے۔

"اور اگر اسے بے حد ٹھنڈا کیا جائے؟"

"تو وہ بے حد ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

انسپکٹر صاحب مسکرانے لگے اور پوچھا: "اچھا اگر پانی کو گرم کیا جائے تب؟"

"تب وہ گرم ہو جائے گا۔"

"نہیں، اگر ہم اسے بہت گرم کریں اور دیر تک گرم کرتے رہیں تب پھر؟"

رومی کچھ دیر سوچتے رہے، یکایک اُچھل کر بولے۔ "پھر۔ چاء بن جائے گی۔" اور انسپکٹر صاحب نے ایک عظیم الشان قہقہہ لگایا۔ ماسٹر صاحبان نے کوشش کی کہ انھیں کہیں اِدھر اُدھر لے جائیں، لیکن وہ وہیں کھڑے رہے، اور رومی سے بولے: "بلی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟"

"تقریباً چار!"

"اور آنکھیں؟"

"کم از کم دو۔!"

"اور دُمیں؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک!"

"اور کان؟" انھوں نے پوچھا۔

"تو کیا سچ مچ آپ نے اب تک بلی نہیں دیکھی؟" رومی مُنہ بنا کر بولے اور انسپکٹر صاحب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے

۔۔۔ ان دنوں سے میں اور رومی دوست تھے۔

میں جج صاحب کے ہاں رہتا تھا۔ پہلے ہمارا کنبہ بھی وہیں تھا پھر ابا کا تبادلہ ہو گیا اور وہ ایسی جگہ تبدیل ہو کر گئے جہاں کالج تو ایک طرف کوئی سکول تک نہ تھا۔ جج صاحب نے ہوسٹل نہ جانے دیا، چنانچہ میں ان کے ہاں رہنے لگا۔ رومی بھی وہیں رہتے تھے اور

جج صاحب سے ان کا کوئی دُور دراز کا رشتہ تھا۔ غالباً وہ جج صاحب کے بھتیجے تھے۔ جہاں کنبے کے تمام افراد مجھے اچھے لگتے تھے وہاں ایک ہستی تو بہت عزیز تھی۔ وہ تھی رضیہ ——————— اور جن سے میں ڈرتا تھا وہ تھیں رضیہ کی بڑی بہن جن کا اصلی نام تو اچھا بھلا سا تھا، لیکن سب بچے انہیں حکومت آپا کہتے تھے۔ میری ہی عمر کی ہوں گی، یا شاید کچھ بڑی ہوں۔ اگر وہ وہاں نہ ہوتیں تو میں اور رضیہ کبھی کے بڑے گہرے دوست بن گئے ہوتے، لیکن ان کو میں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

سارا دن کالج میں گزرتا۔ شام کو کھیلنے چلا جاتا اور رات کو سینما۔ رضیہ سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ ہفتے بھر میں ایک آدھ مرتبہ موقع ملتا اور وہ بھی حکومت آپا کی نذر ہو جاتا۔ بنتی تو ان کی کسی سے بھی نہ تھی، البتہ مجھ سے اور روفی سے خاص لاگ ڈانٹ تھی۔ میں تو چپ ہو جاتا، لیکن روفی ایسا جواب دیتے کہ حکومت آپا کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔

سارا دن لڑتی جھگڑتیں اور دوسروں پر خواہ مخواہ تنقید کرتی رہتیں۔ کسی بات کا شہر میں ڈھنڈورا پٹوانا ہو تو جا کر حکومت آپا کو بتا دو، فوراً ہر ایک کو پتہ چل جائے گا۔

میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ آخر ان کی پالیسی کیا ہے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ روفی کی رائے تھی کہ یہ اپنا وقت بھی ضائع کر رہی ہیں اور دوسروں کا بھی۔ اور مجھے یہ رائے حرف بحرف صحیح معلوم ہوتی تھی۔

ادھر میں اور روفی نہایت عزیز دوست تھے۔ میں ان سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ یہاں تک کہ رضیہ کے متعلق بھی سب کچھ انہیں بتا رکھا تھا۔ اور جو جو باتیں رضیہ اور ہم آپس میں کرتے وہ میں روفی سے فوراً کہہ دیتا اور ہمیشہ اُن کے مشوروں پر عمل کرتا وہ بڑے خلوص سے مجھے بتاتے کہ آج رضیہ سے یہ کہنا' آج یہ پوچھ کر دیکھنا آج یہ کرنا' آج وہ کرنا۔ اور میں اسی طرح کرتا۔

غرضیکہ وہ میرے بے حد عزیز دوست تھے۔

ہمیں ایک صاحب نے سہ پہر کو پکچر پر مدعو کیا۔ چند ماہ پہلے ان سے واقفیت ہوئی تھی' وہ بھی کس طرح؟ وہ ایک دن اپنے ابا کے ساتھ جج صاحب سے ملنے آئے۔ وہاں میں اور روفی بیٹھے تھے۔ ان کے ابا روفی کی باتوں سے پھڑک اُٹھے اور پوچھا "کیوں برخوردار! آج کل کیا کرتے ہو؟"

یہ بولے "جی آج کل بی اے کا امتحان دیا کرتا ہوں" اور حقیقت بھی یہی تھی۔ روفی نہ جانے کتنے سال سے بی اے کا امتحان دے رہے تھے۔"

پھر وہ بزرگ جج صاحب سے بولے۔ "کیا بتاؤں کتنا جی چاہتا ہے کہ آپ کو فون کروں' لیکن ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ آج کل تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا ـــ پہلے پہل یادداشت کے طور پر ایک نوٹ بک میں ایسی باتیں لکھ لیا کرتا تھا' لیکن اب وہ نوٹ بک ہی کہیں بھول جاتا ہوں۔"

روفی نے کہا "جی فون کا نمبر یاد کرنے کے طریقے میں سے ایک

کتاب میں پڑھے ہیں۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟"

وہ بولے "ضرور!"

رونق نے بتایا "وہاں لکھا تھا کہ اوّل تو فقط ایسے حضرات سے راہ و رسم بڑھانی چاہیے جن کے فون نمبر بالکل آسان ہوں۔ مثلاً پانچ ہزار، دو ہزار یا چار سو بیس۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو نمبر کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً ۶۴۵ کو یاد کرنا آسان ہے اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں پچپن جمع کر دیے جائیں تو سات سو بن جائیں گے۔ اور اگر سات سو میں تین سو اور جمع کر دیے جائیں تو ہزار بن جائیں گے، اسی طرح اگر ۶۴۵ کو ۶۴۵ سے ضرب دیا جائے تو فقط ۴۱۶۰۲۵ بن جائے گا۔ اور اگر ہم یاد رکھیں کہ ۶۴۵ محض چھ روپے چار آنے اور پانچ پائی ہے تو اسے کبھی نہیں بھول سکتے۔"

وہ بزرگ بڑے غور سے سُن رہے تھے۔

رونق بولے "اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر یہی بہتر ہوگا کہ تاریخ کی کتاب کھول لی جائے۔ اور اس نمبر کا سنہ تلاش کیا جائے۔ مثلاً ۶۴۵ میں سے اگر چھ کا ہندسہ ہٹا دیں تو ۴۵ رہ جاتا ہے اور ۴۵ قبل از مسیح میں سیزر کو ہمیشہ کے لئے ڈکٹیٹر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ادھر اگر اس میں ایک ہزار جمع کر دیں تو ۱۶۴۵ء میں نیزبی کی لڑائی ہوئی تھی۔"

اس دن سے وہ بزرگ اور ان کے صاحبزادے ہمارے دوست بن گئے۔

پکچر میں دیر تھی۔ میں اروقی کے کمرے میں گیا، دیکھا کہ بیٹھے حامد کو پڑھا رہے ہیں۔ بولے بیگم کہہ گئی ہیں کہ اسے پڑھانا۔ میں بھی پاس بیٹھ گیا۔

روقی نے سوال کیا۔ "کیوں ننھے، دنیا میں کل کتنے اونٹ ہوں گے؟" وہ چپ رہا۔

"اچھا!۔ کیا رومن لوگ گاجریں کھاتے تھے؟"

"پتہ نہیں!"

"ایک سال میں کتنے اِنچ ہوتے ہیں؟"

ننھے نے حساب لگا کر کچھ عجب اُلٹا سیدھا جواب نکال دیا۔

اب روقی خفگی سے بولے۔ "کیا تمہیں سچ مچ پتہ نہیں کہ رومن گاجریں کھاتے تھے یا نہیں؟"

"جی نہیں!" ننھا ڈر کر بولا۔

"اور یہ بھی پتہ نہیں کہ دُنیا میں اونٹ کتنے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"جہالت کی انتہا ہے! کیا تمہیں سچ مچ علم نہیں؟" روقی جھنجھلا کر

"جی نہیں!" ننھا سہم گیا۔

"مجھے خود پتہ نہیں۔" روقی بولے اور ننھے کو چھٹی مل گئی۔

اتنے میں روقی کے نام ایک خط آیا جسے پڑھ کر انہوں نے بہت لمبا سانس کھینچا، ماتھے پر بل ڈالے۔ کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ پھر بولے "کچھ

اور بھی سُنا؟ چھوٹے بھائی صاحب نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔ کس قدر
منع کیا تھا اسے؟ یہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی اگالی ہے۔!"
فوراً نوکر کو بلایا اور ایک تار لکھ کر دیا کہ بھیج دے۔ میں نے تار کی
پڑھی۔ لکھا تھا SHAVE AT ONCE۔ وہ تار اسی وقت بھیج دیا گیا۔
ہم پکچر کے لئے تیار ہو گئے لیکن ہمارے نئے دوست نہیں پہنچے
تھے۔ روفی نے فون کرنا چاہا، لیکن نمبر نہ ملا۔ آخر چڑ کر بولے: "تو
کسی اور کو فون کر دیں؟"

"کسی اور کو؟"

"ہاں! کیا حرج ہے؟ ۔۔۔ کئے دیتے ہیں۔" انہوں نے نہ جانے کون
سے نمبر کو ملا لیا۔ میں سرک کر ریسیور کے نزدیک ہو گیا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" روفی نے پوچھا۔

"خاکسار کو عبدالمجید مجبوؔر کہتے ہیں۔"

"اوہ! عبدالمجید تربوز؟ ۔ تو گویا آپ شاعر بھی ہیں؟" حالانکہ
انہوں نے صاف مجبور کہا تھا۔

"جی نہیں، مجبوؔر!" وہ بولے۔

"معاف کیجئے، میں تو ایسی بے ادبی نہیں کر سکتا۔ آپ کس قدر
کسرِ نفسی کر رہے ہیں؟ یعنی عبدالمجید لنگور ۔!"

"اُفوہ! ۔ مجبور ۔ مج ۔ بور ۔!" وہ بولے۔

"اچھا مجبور صاحب ہیں ۔ آپ کل کتنے بھائی ہیں؟"

"چار ہیں ہم!" وہ بولے۔

"اگر پانچ ہوتے تو ہمارا کیا بگاڑ لیتے۔" روفی بولے اور جلدی

سے ریسیور رکھ دیا۔

اتنے میں وہ صاحب آگئے اور ہم سینما روانہ ہوئے۔ پوچھا پکچر کون سی ہے؟ بولے۔ "انصاف کی توپ۔" میں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ کرکٹ وغیرہ جیسی دلچسپ چیزیں چھوڑ کر اس قسم کی پکچر دیکھنا سراسر بدمذاقی ہے، لیکن روحی نے کہا۔ "چلو اب تیار ہو گئے ہیں تو فلم کا نام خواہ مفلس عاشق ہو یا خونخوار بھیڑیا ہی کیوں نہ ہو، ضرور دیکھیں گے۔"

راستے میں ان صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے متعلق جو باتیں شروع کی ہیں تو ہم تنگ آگئے۔ ان کی تعریفیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ان کے والد منصف تھے اور اچھے خاصے بھاری بھرکم انسان تھے۔ یہ ان کی بڑائیاں کر رہے تھے کہ کس طرح انہوں نے خطرناک عادی مجرموں کو بری کرا دیا اور بظاہر اچھے بھلے معصوم لوگوں کو قید خانے میں بھیج دیا تھا۔ (سکور تو برابر ہی رہا) اب سارے ملک میں ان کے حیرت انگیز انصاف کا ڈنکا بج رہا تھا۔

آخر تنگ آکر روحی بولے۔ "تو وہ بہت اچھا انصاف کرتے ہیں؟"

"یقیناً!" جواب ملا۔

"یعنی نہایت ہی بلند پائے کا انصاف کرتے ہیں وہ؟"

"جی!"

"پھر تو وہ انصاف کی توپ ہوئے۔"

کئی مرتبہ جی چاہا کہ حکومت آپا سے پوچھوں کہ آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ ہم کیا کریں جو آپ کے اس عجیب و غریب عتاب سے بچ سکیں، جو ہر وقت ہم پر نازل ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ہاتھ دھو کر (بلکہ منہ دھو کر) میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ رضیہ کی طرف میں نے ذرا آنکھ اٹھائی اور آفت آ گئی۔

اس میں میرا کیا قصور تھا؟ گھر میں ایک اچھی لڑکی ہے جو اتنی پیاری لگتی ہے تو اُسے کیوں نہ دیکھیں۔ اگر یہی ہے تو حکومت آپا رضیہ کو کسی صندوق میں مقفل کیوں نہیں کر دیتیں تاکہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ جب دیکھو تنقید کر رہی ہیں۔ جس پر پہلے پہل تو میں اداس ہو جایا کرتا۔ لیکن بعد میں عادی ہو گیا۔ اور یہ تنقید کیسی ہوتی؛ شوقین لڑکا ہے رنگین مزاج ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پہنتا ہے۔ خوشبو کیوں لگاتا ہے۔ اس کا سینہ کافی چوڑا ہے، لیکن چہرہ کچھ دبلا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں (نہ کیجئے اعتبار کس مسخرے نے التجا کی ہے آپ سے) ہر وقت بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولتا رہتا ہے (مضبوط پٹھے ہیں کیوں نہ ٹٹولیں) بیزاری کو بزاری کہتا ہے (یہ آپ کے کانوں کا قصور ہے) ہر وقت اکڑ کر چلتا ہے۔ (تو کیا کبڑا ہو کر چلا کروں)۔ رضیہ کے متعلق سوچتا رہتا ہے، اسے گھورتا رہتا ہے اور اسی کی باتیں کرتا ہے (رضیہ اچھی جو لگتی ہے) مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا (مجھے بھی آپ ذرا اچھی نہیں لگتیں)

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔" حکومت آپا کا تکیہ کلام تھا (لفظ "پہلے" پر خوب زور دے کر)۔ ایک دن میں لائبریری سے مشہور لکھاری کیہ

سلطانہ پر تار بھی کتاب لے آیا۔ حکومت آپا نے دیکھ لی، بولیں۔
"مجھے پہلے ہی پتہ تھا"۔ ایک دن ایک ڈرامے میں لگاتار دو گھنٹے رضیہ کو دیکھتا رہا اور اپنا پارٹ غلط سلط کر گیا۔ حکومت آپا دیکھ کر چلا آئیں۔ "مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔" اور روی بولے۔ "جب آپ کو ہمیشہ پہلے ہی سے پتہ ہوتا ہے تو آپ ہمیں پہلے سے ٹوک کیوں نہیں دیتیں۔"
روی اکثر انہیں آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ ایک روز بیگم کا کوئی قیمتی زیور کھو گیا۔ ہم سب ڈھونڈ رہے تھے۔ یکایک روی بولے۔
"حکومت آپا تمہیں تو پتہ ہوگا کہ زیور کہاں ہے"
"مجھے کیا"؟ وہ بولیں۔
"تمہیں پہلے ہی سے پتہ ہوا کرتا ہے۔"
پھر ایک دن سب پریشان بیٹھے تھے۔ کوئی کہتا تھا احمد پاس ہو گیا، کوئی کہتا تھا بالکل فیل ہے۔ ٹیلی فون کیا کوئی جواب نہ آیا۔ جج صاحب بھی پورا زور لگا چکے تھے۔ آخر روی کہنے لگے "تو حکومت اب بتا ہی دو۔"
سب حکومت آپا کے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ کون سی خبر صحیح ہے۔
روی بولے۔ "خواتین و حضرات! ایسے موقعوں پر آپ ہمیشہ حکومت سے مشورہ لیا کیجئے۔ یہ ولی اللہ ہیں اور انہیں ہر چیز کا پہلے سے پتہ ہوتا ہے۔"
اس کے باوجود حکومت آپا کا تکیہ کلام اسی طرح رہا۔
روی مجھے رضیہ کے متعلق طرح طرح کے مشورے تو دیا کرتے لیکن ہمیشہ پریشان رکھتے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ سوال پوچھتے

کہ آخر میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں رضیہ کو اچھا لگتا ہوں؟ یقیناً کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس لئے یہ فقط یکطرفہ کارروائی قرار دی جاتی۔ یعنی کسی کو پسند کرنے سے کچھ نہیں بنتا جب تک کہ وہ بھی جواباً پسند نہ کرے۔ لہٰذا ان کے فارمولے کے مطابق میں اور رضیہ بالکل اجنبی تھے۔

وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ "دنیا بہت بڑی ہے، کہیں اور جا کے کوشش کرو۔ رضیہ سے بھی بہتر لڑکیاں ملیں گی۔" اور مجھے اُن کا یہ مشورہ بالکل پسند نہ آتا۔

ایک روز کہنے لگے۔ "رضیہ کی نظر کمزور ہے، اسے دور کی چیزیں دھندلی دکھائی دیتی ہیں۔"

"تمہیں کیا پتہ؟"

"عید کا چاند اسے نظر نہ آسکا، چنانچہ اس نے جج صاحب کی عینک سے دیکھا تھا۔"

"تو پھر؟"

"پھر کیا، شادی تک تو وہ کیا عینک لگائے گی، البتہ شادی کے بعد فوراً لگالے گی۔"

اُسی شام کو روقی اور حکومت آپا کی بحث ہوگئی، موضوع تھا۔ عینک ۔۔ نہ جانے کون عینک کے خلاف بول رہا تھا اور کون طرف دار تھا۔ غدر سا مچا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر باہر سے سنتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔

روقی کہہ رہے تھے۔ "تو گویا خاکسار جیت ہی گیا؟"

حکومت آپا بولیں۔ "تعجب ہے کہ تین گھنٹے کی بحث کے بعد بھی
آپ قائل نہیں ہوئے۔"

"تین گھنٹے کی بحث کے بعد؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی، تین گھنٹے تک بحث ہوئی۔ پونے تین گھنٹے حکومت بولیں۔
دس منٹ وقفہ رہا اور پانچ منٹ میں بولا۔"

اور وہ جل ہی تو گئیں، کیونکہ وہ بولتی بہت تھیں۔

اتنے میں ٹن ٹن کرتا ہوا آگ بجھانے کا انجن سڑک سے گزرا۔
حکومت آپا بولیں۔ "کہیں آگ لگی ہے شاید اس طرف!"

اتنے میں دوسرا انجن دوسری جانب ٹن ٹن کرتا ہوا چلا گیا۔ حکومت آپا بولیں۔
"وہ! ادھر بھی آگ لگی ہے!"

روفی سر ہلا کر بولے۔ "دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی۔" اور وہ ناراض ہو کر چلی گئیں۔

روفی خوش ہو کر بولے۔ "امرود کھائے جائیں؟" میں نے سر ہلا دیا۔
کہنے لگے۔ "کوئی نوکر آئے تو اُسے باغ میں بھیجتے ہیں۔" اتنے میں جمن
(ڈیو) گزرا۔ یہ جمن صاحب ایک نہایت ہی موٹے نوکر تھے، جنہیں
بچے رات کو دیکھ کر ڈر جاتے۔ اس لئے ان کی ڈیوٹی دن کو لگا
دی تھی۔ رات کو ان کی چھٹی ہوتی۔

روفی نے آواز دی۔ "جمن!" اُس نے سنا ہی نہیں۔ روفی
نے پھر آواز دی۔ اس نے پھر نہیں سُنا۔ روفی بولے۔ انگوٹھی گھسیں۔
"کس کے لئے؟" میں نہ سمجھ سکا۔

روفی نے سمجھایا۔ "بھئی دیو ہے، ایسے ویسے تھوڑا ہی آجائے
گا۔ کم از کم انگوٹھی تو گھسنی پڑے گی۔"

ذرا سی دیر میں جمن پھر گزرا۔ ہم نے بلایا' وہ آگیا۔ روُفی بولے۔ "ہم نے انگوٹھی گھسی تھی۔ تم آئے ہی نہیں۔" ویسے وہ بڑا خوش مزاج تھا' لیکن اس وقت نہایت اداس دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے گھر سے تار آیا ہے۔ اسے فوراً بلایا گیا ہے۔

"گھر سے اوّل تو میں خود واپس آجاؤں گا' ورنہ آپ بُلا لیں۔" اُس نے کہا۔

"ہاں ہاں' ضرور بلا لیں گے۔" میں نے یقین دلایا۔

"بھلا آپ کس پتے پر اطلاع دیں گے؟ کیونکہ میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھروں گا۔"

روفی بولے۔ "اس کا تو یہی علاج ہے کہ تم اپنی مونچھ کا ایک بال ہمیں دے جاؤ۔ تاکہ جب ہم تمہیں بلانا چاہیں تو بال کو دھوپ میں رکھ دیں گے۔ پہلے آندھی آئے گی' پھر مینہ اور بعد میں تم اُڑتے آجاؤ گے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں نے لاحول پڑھی۔

جمن گیا تو دیکھا کہ روفی بھی کمرے میں نہیں تھے۔ دوسرے روز پھر اسی طرح کا واقعہ ہوا۔ مجھے کچھ شبہ سا ہوگیا۔ میں نے رضیہ کو بتایا اور ایک پروگرام بنایا گیا۔ سہ پہر کو چائے پر رضیہ نے جان بوجھ کر لاحول پڑھ دی۔ اور بجلی کی طرح روفی کمرے سے نکل گئے۔ حالانکہ ابھی چائے شروع بھی نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا میں نے سب کو بتادیا۔ کہ چونکہ روفی لاحول سے بھاگتے ہیں اور ان کا حلیہ بھی شیطان سے ملتا ہے' اس لئے آج سے وہ مکمل شیطان ہیں۔ آئندہ کوئی انہیں

روحی نہ کہے۔ شیطان کہے۔ یعنی اگر سامنے ہمت نہ پڑے تو کم از کم پیٹھ پیچھے ہی کہہ دے۔

بس اس دن روحی باقاعدہ طور پر شیطان قرار دیے گئے۔

•

نہایت دلفریب چاندنی رات تھی، پورا چاند درختوں کے جھنڈ سے طلوع ہوا تھا۔ ہوا کے خنک جھونکوں سے پودے جھوم رہے تھے۔ میں فوارے کے پاس بیٹھا تھا۔ خیالات کے سلسلے کو کہیں سے بھی شروع کرتا تھا، ختم رضیہ پر ہوتا تھا۔ یکایک جو دیکھتا ہوں تو پرے رضیہ پلاٹ میں بیٹھی چاند کو تک رہی تھی۔

ان دنوں اکثر میں اُسے تنہا گوشوں میں خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ آخر کس کے متعلق سوچا کرتی ہے یہ؟ میں بے چین ہو گیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور پہنچا سیدھا شیطان کے کمرے میں۔ وہ سو رہے تھے۔ انہیں زبردستی جگایا۔

"ارے!" میرے منہ سے نکل گیا۔ "تم عینک لگا کر سوتے ہو؟"

"کل عینک لگانی بھول گیا تھا، رات بھر خواب دھندلے نظر آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم خواب صاف دکھائی دیں۔"

میں اتنا بے چین تھا کہ مجھ سے ہنسا بھی نہ گیا۔ جلدی سے سب کچھ انہیں بتا دیا اور کہا۔ "رضیہ کو کسی کا خیال ضرور ہے، لیکن یہ پتہ نہیں کہ وہ خوش قسمت ہے کون؟ ویسے وہ آج کل ہر وقت کسی

•

کے متعلق سوچتی ضرور رہتی ہے۔"

دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ سوال یہ تھا کہ کیسے یہ گتھی سلجھائی جائے ویسے میں یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ اسے میرا کس قدر خیال ہے۔

آخری بڑی سوچ بچار کے بعد شیطان بولے۔ "بھئی اس کے لئے تو تھوڑی سی جرأت کرنی پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"اگر میری مانو تو تم خودکشی کر لو۔"

"خودکشی کر لوں؟" میں چونک پڑا۔

"اصلی نہیں نقلی خودکشی۔ ظاہر یہی کریں گے کہ تم سچ مچ خودکشی کر چکے ہو۔ پھر دیکھیں رضیہ کیا کرتی ہے؟"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ بیگم کو ضرور پتہ چل جائے گا اور اگر انھوں نے امی کو لکھ دیا تو آفت آ جائے گی۔ ویسے خودکشی کرنا ہے بھی فضول سی حرکت۔

شیطان بولے۔ "بیگم کو تو ہرگز پتہ نہیں چلنے دیں گے۔ اس اتوار کو سارا کنبہ ایک پارٹی پر جا رہا ہے۔ رضیہ کا امتحان اگلے ہفتے ہے، اس لئے وہ نہیں رہے گی۔ بس میدان صاف پا کر تم خودکشی کر لینا۔ سارا انتظام میں کر دوں گا۔"

ایک طویل بحث کے بعد شیطان نے مجھے ورغلا لیا۔ اگلے روز ہم نے خوب ریہرسل کئے۔

اتوار کا دن آیا۔ رضیہ کے سوا سب پارٹی پر چلے گئے۔ مجھے اور شیطان کو بہتیرا مجبور کیا گیا لیکن ہم نے ایک کرکٹ میچ کا بہانہ کر دیا۔

شیطان کی ہدایات کے مطابق تیاریاں کی گئیں اور پھر میں نے خودکشی کر لی۔ ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ ایک ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا اور فرش پر عین انگلیوں کے نیچے ایک خالی شیشی پڑی تھی۔ جس پر "زہر" لکھا تھا۔ شیطان نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تیار؟" میں نے کہا۔ "ہاں۔" اور انہوں نے ایک عجیب سے بے ڈھنگی آواز میں شور مچانا شروع کر دیا، جس پر مجھے ہنسی آ گئی۔ رضیہ بھاگی بھاگی آئی۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پلکوں میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیطان نے فوراً اسے بتایا کہ میں نے خودکشی کر لی ہے۔ رضیہ نے پہلے شیشی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر میری نبض دیکھی بھلا میں نبض کس طرح بند کر سکتا تھا۔ بولی۔ "اُفوہ! ابھی تھوڑی سی جان باقی ہے۔" گھبرائی ہوئی ساتھ کے کمرے میں گئی۔ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون کر رہی تھی۔ انہیں فوراً آنے کے لئے کہا اور بولی۔ "خدا کے لئے جلدی کیجئے، زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

اور میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ کس کی زندگی اور موت کا سوال ہے؟ میری زندگی کا یا رضیہ کی زندگی کا؟ میں نے شیطان کو اشارہ کیا، وہ مسکرائے۔ رضیہ گھبرائی ہوئی آئی اور میرا سر دبانے لگی۔ اب جو اس کی انگلیاں گردن تک پہنچی ہے تو مجھے سخت گدگدی ہوئی۔ بے حد ضبط کیا۔ آخر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور جلدی سے بیٹھ گیا۔

"ہیں؟" رضیہ کے منہ سے نکلا۔

"ہیں؟" سشیطان نے چنگھاڑ کر کہا

"دیکھا ڈرا دیا نا تمہیں؟" میں بولا۔

"واقعی میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" اس نے کہا اور خوشی کے مارے میرا برا حال ہو گیا۔

تو گویا رضیہ کو میرا بہت خیال تھا۔ اس نے خود جو کہا تھا کہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔

"تو کیا تم سچ مچ بہت گھبرا گئی تھیں؟" میں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

"ہاں کچھ گھبرا ہی گئی تھی۔" وہ مسکرا رہی تھی

"کچھ کیا؟ — یوں کہو کہ مکمل طور پر گھبرا گئی تھیں، بہت بری طرح گھبرا گئی تھیں۔"

"خیر! اتنی تو نہیں گھبرائی — دراصل خودکشی اچھی طرح نہیں کی گئی۔ اس میں کچھ خامیاں رہ گئیں۔"

"اب تم خواہ کچھ ہی کہو۔ ایک مرتبہ تو نہایت پریشان ہو گئی تھیں۔"

"مثلاً اس زہر کی شیشی کو لیجئے۔" وہ بولی۔ "مانا کہ اس میں کبھی ٹنکچر آیوڈین آتی تھی۔ لیکن پورے سال سے اس میں بادام روغن تھا۔ اور اگر واقعی بادام روغن سے خودکشی ہو سکتی ہے، تب بھی یہ عرصے سے خالی پڑی تھی۔"

"لیکن تم نے فون تو بڑی گھبراہٹ میں کیا تھا۔" میں کھسیانا ہو چلا تھا۔

"اچھا بتایئے فون کس کمرے میں ہے؟"

"ڈرائنگ روم میں!" میں نے کہا۔

"اور میں نے فون کس کمرے سے کیا تھا؟ ۔ ساتھ کے کمرے سے نا؟"

"ہاں!"

"اور ساتھ کا کمرہ ہے گودام ۔ اب بتائیے وہاں ٹیلیفون کہاں سے آگیا؟"

— اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں رضیہ کو بالکل اچھا نہیں لگتا، بلکہ شاید بُرا ہی لگتا ہوں۔

اگلے روز ہم سب ایک کلاسیکل رقص کے ماہر کا ناچ دیکھنے گئے بڑا مشہور رقاص تھا۔ بے شمار لوگ آئے تھے۔ شروع میں کچھ گانا بجانا ہوا۔ پھر اس کا ناچ شروع ہوا۔ آرکسٹرا بجنے لگا۔ پہلے تو دیر تک وہ چُپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے یک لخت ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور عجیب سی حرکتیں شروع کر دیں۔

ننھی حیران ہوگئی — "بھیا یہ پتھر کا بُت اب تو خوب ہل رہا ہے!"

اب جو اس اللہ کے بندے نے ہاتھ پیر مارنے شروع کئے ہیں تو ننھی بالکل گھبرا گئی — "بھیا یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟"

حکومت آپا بولیں "یہ ناچ رہا ہے۔"

ننھی نے پوچھا "اس طرح ناچا کرتے ہیں کیا؟"

حکومت آپا بولیں " چپ چاپ دیکھتی رہو، اسے کلاسیکل ناچ کہتے ہیں۔"

ننھی مچل گئی۔ "نہیں تو! یہ آدمی تو کچھ اور تماشا کر رہا ہے۔"

شیطان بولے " ننھی! بات دراصل یہ ہے کہ اس نے علی الصبح فروٹ سالٹ پیا تھا اور اب اشتہاروں کے مطابق اُسے فرحت بخش "فروٹ سالٹ فیلنگ" ہو رہی ہے۔"

شیطان نے سرخ چھینٹ کا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ سب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ انٹرول ہوا تو میں اور شیطان باہر آ گئے۔ چھینٹ کا انگرکھا واقعی عجیب سی چیز تھی۔ جو دیکھتا تھا۔ ٹھہر جاتا تھا۔ چند حضرات نے تو سچ مچ ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان رک گئے اور پیچھے مڑ کر بولے " حضرات آپ کی ہنسی سر آنکھوں پر۔ لیکن آپ براہ کرم جلدی سے ہنس لیجئے، کیونکہ مجھے ایک ضروری کام پر جانا ہے۔ اور بغیر آپ کے شوق کی تکمیل کے میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔" وہ کچھ شرما سے گئے۔

" تو آپ ہنس چکے کیا؟" شیطان نے پوچھا۔ وہ چپ رہے۔

" کیا بندہ جا سکتا ہے؟" ان میں سے ایک نے سر ہلا دیا۔

ہم جب واپس آئے تو ابھی اچھا خاصا دن باقی تھا۔ باغ سے گزرتے ہوئے شیطان رک گئے، مالی کو بلایا اور مٹی کا ایک ڈھیر دکھا کر کہا۔" یہ ڈھیر یہاں نہیں ہونا چاہیئے۔"

" جناب یہ بغیر کئی مزدوروں کے باہر نہیں پھینکا جا سکتا۔"

" واہ! معمولی سا کام ہے۔ ایک بڑا سا گڑھا کھود لو اور اس پہ

یہ مٹی دبادو۔"

بات مالی کی سمجھ میں آگئی اور وہ کام میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر ہمارے پاس آیا اور بولا۔ "جناب وہ مٹی تو بھر دی گئی ہے، لیکن جو نئے گڑھے کی مٹی ہے اس کا کیا کیا جائے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ ایک اور گڑھا کھود کر اس میں دبا دو۔" شیطان نے کہا۔ مالی پھر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہانپتا ہوا آیا اور پوچھا۔ "وہ مٹی تو دبا دی گئی، لیکن اب نئے گڑھے کی مٹی؟ ـــــ وہ کہاں پھینکی جائے؟"

"ہمیں نہیں پتہ۔" شیطان جھلّا کر بولے۔ "معمولی سی بات ہے، ایک اور گڑھا کھود لو۔" اور مالی بے چارہ سر کھجاتا ہوا چلا گیا۔ اتنے میں جج صاحب تشریف لے آئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ ہم کھیلوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

"تمہیں کون سے کھیل پسند ہیں؟" جج صاحب نے پوچھا۔

"کبڈی اور پولو۔" شیطان نے جواب دیا۔

"کوئی خاص اچھے کھیل تو نہیں ہیں۔" وہ بولے

"آپ کو کون سا کھیل مرغوب ہے؟" شیطان نے پوچھا۔

"اسے کھیل تو نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے گھڑ دوڑ بہت پسند ہے۔ جب میں یورپ میں تھا تو نہایت شوق سے گھڑ دوڑ دیکھا کرتا تھا۔"

"معاف کیجئے مجھے گھڑ دوڑ بالکل پسند نہیں۔" شیطان بولے۔

"وہ کیوں؟"

"دیکھئے نا، یہ سب جانتے ہیں کہ کچھ گھوڑے کچھ گھوڑوں سے تیز

دوڑتے ہیں۔ اور یہ بھی لازمی امر ہے کہ بہت سے گھوڑے دوڑیں گے۔ تو کچھ آگے نکل جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے اور آخر میں یہ ایک گھوڑا سب سے آگے نکل جائے گا۔ بھلا یہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ کون سا گھوڑا آگے نکلتا ہے؟ یا تو یہ ہو کہ اپنا پالتو گھوڑا حصّہ لے رہا ہو۔ یا کسی گھوڑے سے واقفیت ہو تو اُسے دیکھنے آدمی چلا بھی جائے۔ ورنہ سب گھوڑے ایک جیسے ہیں"۔

جج صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر مسکرا کر بولے۔ لاحول ولا قوۃ

اور دفعتاً شیطان کمرے سے نکل گئے۔

مجھے اور شیطان کو ایک بہت بڑی دعوت پر بلایا گیا۔ بڑے مدبر قسم کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ جج صاحب اور بیگم صاحبہ وہاں نہیں تھے، چنانچہ ہمیں پوری آزادی مل گئی اور شیطان اُتر آئے الٹی سیدھی حرکتوں پر۔ ایک خطرناک سے بزرگ ہماری طرف بہت بُری طرح دیکھ رہے تھے۔ کچھ مولینا سے معلوم ہوتے تھے۔ نہ جانے کیوں اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہے تھے۔ آخر جب ان سے نہ رہا گیا تو شیطان سے بولے۔ "صاحبزادے! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پُورے آدھ گھنٹہ سے ان لڑکیوں کو گھور رہے ہو۔ یہ نہایت بُری بات ہے"۔

شیطان نے جواب دیا "قبلہ گھورنا دو قسم کا ہوتا ہے۔ گھورنا بالتحقیق اور گھورنا بالتفریح — یہ خاکسار اس وقت اول الذکر کر رہا ہے، کیونکہ مجھے ابھی کسی نے بتایا ہے کہ ان خاتون کی ناک ترچھی ہے اور ایک آنکھ بڑی ہے ایک چھوٹی۔"

مولانا ابھی کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ شیطان نے جلدی سے ٹوکا۔
"اور آپ ان کو کیوں نہیں منع کرتے ہو جو گھورنا بالتفریح کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ایسے یہاں بے شمار حضرات ہیں مثال کے طور پر ان صاحب کو (اشارہ کر کے) ہی لیجئے جو زیرِ مونچھ مسکرا رہے ہیں؟"

"لوگ زیر لب مسکرایا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی مونچھیں اس قدر گھنی اور خونخوار ہیں کہ ہم اس مسکراہٹ کو محض زیرِ مونچھ مسکراہٹ ہی کہہ سکتے ہیں۔ غالباً ان صاحب کا نعرہ یہ ہوگا کہ — مونچھوں کے سایے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں۔"

بات شروع کہاں سے ہوئی تھی اور جا پہنچی کہاں۔ مولانا کھسیانے ہو کر کہنے لگے۔ "خیر! کچھ بھی ہو، ہر حال میں انسان کو پرہیز گار ہونا چاہیے۔"

"میں پرہیز گار ہوں۔" شیطان بولے۔

"تم اور پرہیز گار! — نعوذ باللہ!"

"جی نہیں، الحمد للہ مجھے فخر ہے کہ ماشاءاللہ میں پرہیز گار ہوں اور انشاءاللہ ہمیشہ رہوں گا۔ پرہیز گار وہ شخص ہے جو گرم، کھٹائی، چکنی اور گرم چیزوں اور مرچ مسالے سے پرہیز کرے اور میں کرتا ہوں۔"

اتنے میں چند مہمان آ گئے اور ہمارا تعارف ان سے کرایا گیا۔ وہ مولانا ادھر اُدھر ہو گئے۔ جہاں چاروں طرف شور و غل مچا ہوا تھا۔ وہاں ایک صاحب کو دیکھا جو چپ چاپ بیٹھے تھے، جیسے مراقبے میں ہوں۔ شیطان نے ان سے باتیں شروع کر دیں۔

"جناب اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"فرمائیے۔!"

"آپ چُپ کیوں ہیں؟"

"بس یونہی!"

"تو صاحب اگر آپ عقلمند ہیں تو بے وقوفی کر رہے ہیں اور اگر بے وقوف ہیں تو عقلمندی کر رہے ہیں۔" اور وہ صاحب سوچنے بیٹھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا۔

اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پر وہ مولانا ہمیں پھر مل گئے اور بدستور بڑے غیظ و غضب سے ہمیں گھورنے لگے۔ شیطان چاہتے تھے کہ ان سے باتیں ہوں، لیکن کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ اتنے میں چند چھوٹے قد کی خواتین داخل ہوئیں، بالکل چھوٹی چھوٹی تھیں۔ شیطان سے بولے: "دیکھئے قبلہ! یہ پینگوئن سیریز (PENGUIN SERIES) کی خواتین ہیں۔"

اور انہوں نے نہایت خطرناک انداز سے 'ہُوں' کی۔

اسی وقت ایک نہایت ہی دُبلے صاحب ایک بہت زیادہ موٹے صاحب کے ساتھ داخل ہوئے۔ دونوں میں اس قدر فرق تھا کہ ایک دوسرے کو بڑی طرح نمایاں کر رہے تھے۔

شیطان بزرگ کے قریب سرک کر بولے: "وہ دیکھئے جناب ان میں سے ایک۔ استعمال سے پہلے' اور دوسرے۔ استعمال کے بعد!"
بزرگ شاید سمجھ نہ سکے۔

شیطان نے وضاحت کی: "آپ نے مقوی دواؤں کے اشتہار تو دیکھے ہوں گے۔ وہاں استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد کے فوٹو بھی ملاحظ فرمائے ہوں گے۔ بالکل وہی چیز آپ یہاں دیکھ لیجئے۔"

دروازہ کھلا اور ایک نہایت ہی چھوٹے قد کے حضرت اور ایک بہت ہی دُبلے لمبے حضرت داخل ہوئے۔ ان کے قد میں کوئی چار پانچ فٹ کا فرق ہوگا۔

مولینا جھلا کر بولے: "ان پر تم نے کچھ نہیں کہا؟ کچھ دوان کے متعلق بھی۔!"

شیطان بولے: "اجی کیا خاک کہوں؟ سب دیکھ رہے ہیں کہ گلی ڈنڈا آ رہا ہے۔"

اتنے میں کھانا شروع ہو گیا۔

ہم دونوں جان بوجھ کر مولانا کے قریب بیٹھے۔ شاید انہیں مچھلی بہت مرغوب تھی۔ چنانچہ کئی مرتبہ مچھلی منگوائی۔ اب جو وہ مچھلی منگواتے ہیں تو ملازم اِدھر اُدھر کی چیزیں تو دے جاتا، لیکن مچھلی نہ لاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ ختم ہو گئی ہے، لیکن ان کا اصرار یہی تھا کہ مچھلی لاؤ۔ بیچارہ

ملازم صاف جواب بھی نہ دے سکتا تھا اور ہاں بھی کہہ جاتا۔ آخر اُن سے نہ رہا گیا اور نعرہ لگایا: "یہ کم بخت مچھلی کیوں نہیں لاتا؟ اور اب تو غائب ہی ہو گیا ہے، نہ جانے کہاں؟"

"مچھلیاں پکڑنے گیا ہے۔!" شیطان بولے۔

باہر زور کی بارش شروع ہو چکی تھی، چنانچہ کھانے کے بعد یہ طے ہوا کہ بارش تھمنے کا انتظار کیا جائے اور اتنی دیر کافی کا دوسرا دَور چلے۔

سب لوگ خاموش ہو گئے اور ایک بزرگ نے (جن کو ہر وقت ملول و محزون باتیں کرنے پر فانی کہا جاتا تھا اور جو فوراً ہی صدر بنا دیئے گئے تھے) ایک صاحب سے کہا "جب تک بارش نہیں رُکتی آپ بیتیاں بیان کی جائیں گی۔ پہلے آپ اپنی زندگی کا کوئی سچا غمناک واقعہ سنائیے۔" انہوں نے سنا دیا۔ ساتوں نمبر شیطان کا آیا۔ چونکہ پہلے نہایت ہی دردناک کہانیاں سنائی گئی تھیں۔ اس لئے لوگ سہمے بیٹھے تھے۔ شیطان نے شروع کیا "خواتین و حضرات! یہ واقعہ میری حیاتِ فانی میں سنگِ میل کا کام دیتا ہے۔ اس نے میری فانی زندگی پر سب سے لافانی اثر ڈالا۔" اور سب چپ ہو کر بڑی توجہ سے سُننے لگے۔

"یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں گٹکا کھیلا کرتا تھا۔ آپ لوگوں میں سے جن کو یہ پتہ ہے کہ گٹکا ہوتا کیا ہے انہیں معلوم ہو کہ میں اب بھی اپنے کالج کا بہترین گٹکے باز ہوں۔ لیکن ان دنوں خوب مہارت تھی۔ ایک دن ہم سب کالج کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ موسلا دھار

بارش ہو رہی تھی۔ ہم منتظر تھے کہ کب بارش ختم ہو اور باہر نکلیں۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ایک جگنو اُڑا جا رہا ہے۔"

" دن میں جگنو؟" ـــ انہی مولانا نے پوچھا۔

" جی ہاں ـــ یا پھر جگنو کی قسم کا کوئی اور پرندہ ہوگا۔"

" جگنو پرندہ ہے کیا؟" مولانا نے پھر پوچھا۔

" اجی قبلہ! جو چیز اُڑتی ہے وہ پروں سے اُڑتی ہے، لہٰذا پرندہ ہے ہاں تو سب لڑکوں کا جی للچایا کہ اسے پکڑیں، مگر بارش کی وجہ سے کسی کی ہمت نہ پڑی۔ آخر میں تیار ہوا۔ لڑکوں نے منع کیا کہ بھیگ جاؤ گے۔ میں نے ایک نہ سُنی اور باہر نکل آیا۔ گتکے کا ماہر تھا۔ ایک بوند آئی۔ اسے گردن کی ایک جنبش سے بچا گیا۔ دوسری آئی اُسے ایک طرف ہٹ کے بچایا۔ تیسری آئی۔ اسے کمر کی حرکت سے بچایا۔ غرضیکہ اسی طرح بل کھاتا، طرح طرح کے پینترے بدلتا ہوا ایسی موسلا دھار بارش میں جگنو کو صاف پکڑ لایا۔ اور جب واپس برآمدے میں پہنچا تو میرے لباس پہ ایک بوند بھی نہیں تھی۔"

اب جو قہقہے لگے ہیں تو فضا کی سنجیدگی یکلخت ختم ہوگئی۔ صدر صاحب نے اُٹھ کر فرمایا۔ "رونی صاحب! ہم آپ سے ایک سنجیدہ واقعہ سننا چاہتے ہیں اور آپ کو دس منٹ دیتے ہیں۔ اتنے میں رنجوری صاحب اپنی رنجیدہ داستان سنائیں گے۔"

اتفاق سے یہ وہی صاحب تھے جو اتنی دیر سے گم صُم بیٹھے تھے۔ بیچارے گھبرا گئے، سوچا کہ یہ کیا آفت آئی۔ بہتیرا پیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہاں کون سُنتا تھا۔ آخر تنگ آ کر بولے: "مجھے اپنا کوئی واقعہ تو یاد

نہیں، فقط ایک لطیفہ ذہن میں آرہا ہے جو میں نے دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھا تھا۔ وہ یہ کہ ایک جگہ چار بیوقوف بیٹھے تھے ایک نے پوچھا کہ اگر دریا میں آگ لگ جائے تو مچھلیاں کدھر جائیں گی؟ دوسرا بولا، درختوں پر چڑھ جائیں گی۔ تیسرے نے فوراً اے"
"اجی حضرت وہ تو تین تھے یہ چوتھا بے وقوف آپ کہاں سے لے آئے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔
"چوتھے یہ خود تھے"! شیطان بولے۔ اور لوگ چیخیں مار مار کر ہنسنے لگے۔

اب صدر صاحب نے شیطان سے درخواست کی کہ وہ ایک سنجیدہ واقعہ سنائیں۔
"شیطان نے کہا۔ آج سے چند سال پہلے کا ذکر ہے۔ یہی کمرہ تھا اور میں یہاں ذاکر صاحب (میزبان کے صاحبزادے) کے ساتھ آیا تھا۔ کوئی رات کے دس بجے تھے۔ بالکل ایسے ہی بارش ہو رہی تھی۔ میں گھر نہ جا سکا۔ اور اسی کمرے میں سونا پڑا (اشارہ کرکے) میرا بستر یہاں بچھا ہوا تھا۔ میں لیٹ گیا۔ سگریٹ ختم ہو چکا تھا، میں نے اسے بے خبری کے عالم میں ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ نیچے قالین بچھا ہوا ہے۔ جلتا سگریٹ پھینکا تھا۔ جھانک کر جو دیکھتا ہوں تو پلنگ کے نیچے سے ایک سوکھا ہوا ہاتھ نکلا اور سگریٹ کو اٹھا کر پھر پلنگ کے نیچے غائب ہو گیا۔" سب کے سب سہم گئے۔
"اور خواتین و حضرات! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہاتھ کسی زندہ شخص کا نہیں تھا۔ بالکل سوکھا ہوا اور مرجل ہاتھ تھا۔ خیر اسی

نے آیۃ الکرسی پڑھی۔ سوچا کہ شاید وہم ہوا ہوگا اور کچھ گنگنانے لگا۔ پھر
خیال آیا کہ اب سو جانا چاہیئے، چنانچہ میں نے یونہی کہہ دیا۔ 'ارے
یہ بجلی جل رہی ہے اسے تو بجھانا ہی بھول گیا'، یہ کہہ کر اٹھنے لگا کہ
کونے سے آواز آئی اور کسی نے بجلی بجھا دی۔ اب جو میں اس کمرے سے
ہڑبڑا کر بھاگا ہوں تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔۔۔!"

"پھر کیا ہوا؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"پھر ہم نے اس مکان کا کونا کونا تلاش کیا۔ پلنگ کے نیچے بھی
دیکھا، لیکن کچھ نہ ملا۔ سو یہ کمرہ آسیب زدہ ہے۔ اور ۔۔۔ ارے!۔۔
یہ مرغی کہاں سے آگئی؟"

شیطان نے ایک تاریک گوشے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سب
لوگ اکٹھے کھڑے ہو گئے۔

"اُفوہ!" شیطان نے اُچھلتے کودتے ہوئے کہا۔ "غضب خدا کا!
یہ مجھے گدگدیاں کون کر رہا ہے۔" اور بے تحاشا اچھلنے کودنے لگے۔

"اور یہ میرے کان میں چٹکیاں کون مار رہا ہے؟" شیطان چلا کر
بولے۔ "اور یہ پردے کے پیچھے سے اونٹ کیوں جھانک رہا ہے؟"

اور کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ شیطان نے مجھے اشارہ کیا اور میں
نے چپکے سے بجلی بجھا دی۔ اب جو دھما چوکڑی مچی ہے تو الاماں! سب کے
سب کمرے سے باہر نکل آئے اور برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔

ذرا سی دیر میں لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ہم پہلی منزل
کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ مولانا بھی ساتھ تھے اور نیچے جھانک
رہے تھے۔ غالباً انتظار تھا کسی کا۔ اتنے میں ایک تانگہ گزرا۔ "مولانا!"

چلا کر بولے۔ "بھئی ٹھہرنا تمہارا تانگی خالہ ہے کیا؟"

ادھر تانگے والے نے سنا ہی نہیں۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ لیکن شیطان نہایت سنجیدگی سے بولے۔

"قبلہ! اگر آپ یوں فرماتے تو بہتر تھا۔ کہ تمہاری خالہ تانگی ہے کیا؟"

مولانا جھینپ گئے۔ انہوں نے جان بوجھ کر تھوڑا ہی کہا تھا، یوں ہی منہ سے نکل گیا۔ ویسے وہ ڈرے ہوئے تھے۔

تانگے کا انتظار ہوتا رہا۔ شیطان نے مولانا سے پوچھا "کیوں صاحب آپ کی گھڑی میں کیا گھڑا ہے؟"

"بارہ بجنے والے ہیں۔" وہ بولے۔

"میرے خیال میں اب چلنا چاہیئے۔ سڑک پر تانگہ ضرور مل جائے گا۔" اور ہم تینوں نیچے اترنے لگے۔

"قبلہ! ان سیڑھیوں کے متعلق بھی ایک پُراسرار قصہ ہے، جسے میں اس اندھیرے میں سنانا نہیں چاہتا۔" اور مولانا اور بھی آہستہ آہستہ اترنے لگے۔

"اجی آپ تو بچے کرکے اتر رہے ہیں۔ ذرا جلدی کیجئے۔" شیطان بولے۔

"ویسے ہی ذرا۔ چکنی سیڑھیاں ہیں۔ کہیں۔" وہ کہنے لگے۔

"جی ہاں! واقعی! سیڑھیاں اترتے چڑھتے وقت خیال رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ پرسوں ہی کا ذکر ہے کہ میں جلدی جلدی زینے سے اتر رہا تھا۔ یکلخت جو ایک پھسلی سے سیڑھا تو دور تک سیڑھتا ہوا چلا گیا۔"

شیطان کو ٹوپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ میرے پاس آئے۔ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں اپنا جیب خرچ اور سکالرشپ وغیرہ سب ختم

کر چکا تھا۔ یہ طے ہوا کہ حکومت آپا ہمیشہ امیر رہتی ہیں، اُن سے اُدھار لیے جائیں۔

شیطان حکومت آپا کے پاس گئے اور بولے۔ "ذرا باغ میں چلیے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ متعجب ضرور ہوئیں۔ باغ میں پہنچے۔ وہاں شیطان نے چٹکی بجائی اور بولے۔ "ارے! وہ تو وہیں کمرے میں کہنا تھا۔" اب پھر کمرے میں پہنچے۔ وہاں جاکر کچھ دیر سوچتے رہے، پھر کہنے لگے "میں بھی کیسا خبطی ہوں! دراصل وہ بات صرف چھت پر کہی جا سکتی ہے۔" میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ مختصر سی بحث کے بعد دونوں چھت پر پہنچے۔ وہاں جاکر شیطان نے التجا کی کہ اگر وہ بات دالان میں سنائی گئی تو بہتر رہے گا اور حکومت آپا مچل گئیں۔ خیر! دالان میں پہنچے۔

"اب میں یہاں سے ہرگز نہ ہلوں گی۔" انھوں نے کہا۔

شیطان نے سرگوشی کی۔ "تم ان دنوں بہت اچھی معلوم ہو رہی ہو؟" اور حکومت آپا فوراً بولیں۔ "روپے دراصل میرے پاس بھی نہیں ہیں۔"

شیطان بولے۔ "یقین کرو کہ تم بہت ہی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔"

وہ بولیں۔ "یقین کیجیے کہ میں اس وقت بالکل قرض نہیں دے سکتی۔"

شیطان نے جلدی سے کہا۔ "قرض کون مسخرہ مانگتا ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم پرسوں سے بہت حسین لگ رہی ہو۔ فقط پرسوں سے۔!"

اسی طرح دیر تک الٹی سیدھی ہانکنے کے بعد حکومت آپا کو یقین دلا

دیا کہ واقعی یہ سچ کہہ رہے ہیں۔ وہ شرما گئیں اور آہستہ سے بولیں۔
"کیا اچھا لگ رہا ہے آخر؟"

"خدا جانے کیا اچھا لگ رہا ہے، لیکن پرسوں سے میری حالت مخدوش ہے۔ محض پرسوں سے!"

"پرسوں کیا بات تھی ایسی؟" وہ اور بھی شرما گئیں۔

"پرسوں جب تم اپنے کمرے میں بیٹھی بسور رہی تھیں تو بس اس وقت تم مجھے بہت ہی اچھی لگیں۔ میں اسی انتظار میں رہا کہ تم روتی کب ہو، لیکن جب ایک آنسو بھی نہ نکلا تو میری آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ کاش کہ تم پھوٹ پھوٹ کر روتیں۔ خیر اگلی مرتبہ جب کبھی رونے کا پروگرام ہو، مجھے ضرور بلانا۔"

اب تک ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ رضیہ ہر وقت کس کے متعلق سوچتی رہتی ہے۔ ویسے ہمیں یہ یقین تھا کہ اُسے کسی نہ کسی کا خیال ضرور رہتا ہے۔

میری اور شیطان کی یہی بحث رہتی۔ وہ عجیب عجیب حرکتیں مجھ سے کراتے۔ ایک روز بولے۔ "رضیہ کو مونچھیں پسند ہیں، مونچھیں رکھ لو۔" میں نے رکھ لیں۔ پھر بتایا۔ "اسے برابر مونچھیں پسند نہیں، ایک طرف کی بڑی ہو، دوسری طرف کی چھوٹی ہو۔" میں نے کچھ روز اپنی ہنسی اڑائی۔ پھر کہنے لگے۔ "اسے مونچھیں پسند ہی نہیں۔" چنانچہ صاف کرا دی گئیں۔

ایک دن مجھے رضیہ کو اس کی کسی سہیلی کے ہاں چھوڑنے جانا تھا۔ شیطان نے مشورہ دیا۔ "خوب اچھے سے کپڑے پہن کر جانا، رضیہ کے

ساتھ چلوگے ۔ شان رہے گی "۔ میں پوچھ بیٹھا کہ رضیہ کو کس قسم کا لباس پسند ہے؟ کہنے لگے ۔" تم اسی وقت جاکر سرخ رنگ کی پتلون پہن لو اور سبز رنگ کا کوٹ ۔ زرد رنگ کی ٹائی' براؤن جوتے' نیلی قمیص اور فاختی رنگ کا رومال ۔ جاؤ ابھی پہن کر آجاؤ"

اور جب میں اور رضیہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو جو بھی راستے میں ملتا وہ نہ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورتا' بلکہ دیر تک مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا ۔

آخر رضیہ سے نہ رہا گیا " یہ آپ کو سوجھی کیا تھی ؟"

" کیا ۔ ؟"

" یہ لباس کیا پہن آئے ہیں ؟ بالکل ٹیکنی کلر میں رنگے ہوئے ہیں"

ایک دن شیطان نے نہایت لاجواب تجویز سوچی کہ ایک ڈراما سٹیج کیا جائے جو میرے نام سے مشہور کیا جائے ۔ انتظام سارا شیطان کریں گے ۔ تجویز معقول تھی ۔ رضیہ پر تھوڑا سا رعب جمایا جا سکتا تھا ۔

پورے مہینے بھر کی تیاریوں کے بعد ہم نے ایک رومان انگیز ڈرامہ تیار کر لیا ۔ اب ڈرامے کے نام کا سوال آیا تو شیطان بولے ۔" اس کا نام ' بے گناہ اونٹ ' ٹھیک رہے گا ۔"

" لیکن اس کا پلاٹ تو رومانی ہے اور اس میں اونٹ کہیں بھی نہیں آتا "

" آج کل لوگ ایسے اچھوتے خیالات پر تو جان چھڑکتے ہیں ۔ یہ بہترین نام ہے ۔ ویسے اور نام بھی ہیں مثلاً عاشق ۔ یا پریم کا جادو ۔ یا ۔ !"

اور میں فوراً مان گیا

"اچھا! اب اس کا عرف ضرور ہونا چاہیے۔ عرف کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ابھی میں نے ایک نہایت غمناک اور درد انگیز رومانی افسانوں کی کتاب پڑھی ہے۔ جس کا نام تھا 'آنسو اور ستارے' عرف 'اس نے شرارت کی'۔ اس عرف نے مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔"

"تو پھر رکھ لو عرف۔ کیا رکھو گے؟"

"میرے خیال میں تو یوں ٹھیک رہے گا۔ 'بے گناہ اونٹ' عرف 'آ بیل مجھے مار'۔"

"لیکن اس میں بیل بھی کہیں نہیں آتا۔"

"پھر وہی باتیں کیں تم نے" شیطان نے ڈانٹا' اور میں مان گیا۔

مجھے شہزادہ بنایا گیا۔ شیطان نے اپنا اصلی پارٹ کرنا قبول کر لیا' یعنی وہ شیطان بنے۔ ایک صاحب پریوں کی شہزادی بنائے گئے اور ان کی حجامت اس بری طرح کی گئی کہ چہرہ کھرچ دیا گیا۔ آس پاس کے بیشتر معزز حضرات مدعو کیے گئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک یار جنگ بہادر صاحب تشریف لائے تھے۔ ان کی آمد باعثِ فخر تھی۔

کلب میں ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے پردہ اٹھا۔

میں ایک اندھیرے باغ میں کودا۔ وہاں جلدی سے پریوں کی شہزادی پر عاشق ہوا۔ پھر چاند کو طلوع ہونا تھا۔ اور مجھے ایک درد انگیز تقریر کرنی تھی۔ اب میں عاشق ہو کر چاند کا انتظار کر رہا ہوں۔ اُدھر چاند ہے کہ نکلتا ہی نہیں۔ آخر تنگ آ کر میں نے بغیر چاند کے تقریر شروع کر دی۔

اتنے میں یکلخت چاند طلوع ہوا اور بڑی تیزی سے آسمان (سٹیج) کو عبور کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن میں نے تقریر جاری رکھی۔ اب چپکے سے چاند پھر نکل آیا اور میں نے ایک گھٹنے کے بل جھک کر دہنا ہاتھ بڑھا کر کچھ کہنا شروع کیا ہی تھا کہ جو دیکھتا ہوں تو چاند دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اب جو اس طرف مُنہ کرتا ہوں تو چاند ادھر آ گیا۔ غرضیکہ میری اور چاند کی خوب آنکھ مچولی ہوئی۔

اسی طرح ایک نہایت خوشنما سین پر یکلخت سارے قمقمے بجھ گئے اور جب دوبارہ جلے تو سارا مزا کرکرا ہو چکا تھا۔ اب جو پردے کی مصیبت شروع ہوتی ہے تو میں جھنجھلا اُٹھا۔ جب کہیں اچھا سا سین آیا دھڑام سے پردہ گر گیا اور لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ خیر بڑی مصیبتوں کے بعد انٹرول ہوا۔ اب شیطان سٹیج پر آ کر فرماتے ہیں۔ "خواتین و حضرات! میں ڈرامے کے پروڈیوسر (میرا نام لے کر) کے متواتر اصرار پر ان کی طرف سے جناب بر یار جنگ بہادر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سٹیج پر تشریف لا کر حاضرین کو ایک ٹھمری یا دادرا سُنائیں۔ نیز ہمارا طبلچی بہت ہشیار ہے۔ خواہ کیسی ہی راگنی وہ چھیڑیں، ساتھ چل نکلے گا۔"

حاضرین دم بخود رہ گئے اور وہ یار جنگ بہادر صاحب مع اپنے کنبے کے فوراً اُٹھ کر چلے گئے۔ اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ میں شیطان سے کچھ کہتا۔

پردہ اُٹھا۔ ذرا سی دیر میں شیطان کا پارٹ شروع ہونا تھا۔ اب جو انہیں ڈھونڈھتے ہیں تو وہ غائب ہو چکے تھے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔

طے ہوا کہ جلدی سے ایک اور شیطان بنایا جائے۔

سین یوں تھا کہ پریوں کی شہزادی باغ میں ٹہل رہی ہے اور اسے ایک گستاخ قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ وہ چونک کر کہتی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ تو شیطان ہے اور مجھے ڈرانا چاہتا ہے، لیکن میں تجھ سے ہرگز نہیں ڈروں گی۔ یہ کہہ کر وہ ایک گانا گاتی ہے۔

قہقہہ نقلی شیطان سے لگوایا گیا۔ ہیروئن نے اپنے فقرے کہہ دیے۔ یکلخت ایک دھماکا ہوا۔ سٹیج کی چھت سے ایک شعلہ سا تڑپا اور دھم سے کوئی عجیب الخلقت چیز کودی۔ جس کا رنگ سبز تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ دو چمکیلے سینگ تھے۔ نکیلے کان اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ نہایت ہیبت ناک شکل تھی۔ ہیروئن نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ ہم سب حیران رہ گئے۔ اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو یہ اصلی شیطان یعنی روفی تھے۔ جو اپنا میک اپ خود کر کے آ رہے تھے۔

ہیروئن اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ اس نے ایک عجیب بے ڈھنگے سُر میں غلط گانا شروع کر دیا۔ "رس کے بھرے تورے نین" اس کا ترنم بالکل انگریزی موسیقی معلوم ہو رہا تھا۔ شیطان نے نہایت ہیبت ناک آواز میں ہنسنا شروع کر دیا اور بے شمار بچے چلا چلا کر رونے لگے۔ جو بچہ روتا اسے گھر بھیج دیا جاتا۔

اب جو ڈرامائی ایکٹنگ شیطان نے شروع کی ہے تو حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ ایک ایک کر کے سب خواتین چلی گئیں۔

غرضیکہ شیطان نے دل کھول کر دھاچوکڑی مچائی۔ آخر میں تو یہاں

تک نوبت پہنچ گئی کہ انہوں نے بلا وجہ خود ساختہ فقرے بولنے شروع کر دیے۔ اور ہر سین میں اسٹیج پر آنا شروع کر دیا خواہ ان کا پارٹ ہو یا نہ ہو۔ پھر وہ سین آیا جس میں شیطان کو جادو کے منتر سے ہلاک کرنا تھا۔ میں نے منتر کئی مرتبہ پڑھا لیکن شیطان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے چپکے سے کہا۔ "اب مر بھی جاؤ۔" پرامپٹر نے بھی کہا "مر جائیے ردقی صاحب۔" اسٹیج کے پیچھے سے آواز آئی۔ "مر جائیے قبلہ۔" لیکن وہ پھر بھی نہ مرے۔ آخر میں نے غصے سے کہا "مرتے ہو یا نہیں؟"

شیطان زور سے بولے۔ "نہیں مرتے۔" اور لوگ ہنسنے لگے۔

"اچھا تو یہ بات ہے؟ اُٹھوں پھر؟" میں سچ مچ اُٹھنے لگا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شہزادوں کی شان کے شایاں نہیں کہ معمولی سے شیطان پر ہاتھ اٹھائیں۔ چنانچہ میں نے تالی بجائی۔ چند سپاہی آگئے ان سے کہا۔ "لے جاؤ اس شیطان کو گرفتار کرکے قتل کر دو۔"

"جہنم میں بھیج دو۔" حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا۔

"ہاں قتل کرکے جہنم میں بھیج دو۔"

"نہیں جاتے ہم۔" شیطان نے اپنے لمبے لمبے نکیلے ناخن دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر۔ لاحول ولا قوۃ!" میں نے زور سے کہا۔

اور شیطان یکلخت اُچھلے اور چھلانگ مار کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

•

•

اس کے بعد مجھ پر چاروں طرف سے بوچھاڑ ہوئی۔ سب کچھ میرے ذمے منڈھ دیا گیا۔ شیطان صاف بچ گئے۔ حکومت آپا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کچھ خبطی سا لڑکا ہوں ورنہ اس قسم کی حرکتیں کبھی نہ کرتا۔ اور یہ بھی کہا کہ ڈرامے کے دوران میں رضیہ کو گھور رہا تھا۔ لیکن رضیہ کے متعلق پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس قدر ناراض ہوئی۔

کچھ روز بہت پریشانی رہی۔

پھر حکومت آپا کی سالگرہ پر ایک دعوت ہوئی۔ ان کی سہیلیاں آئیں۔ بزرگوں نے شمولیت سے عمداً پرہیز کیا۔ میں اور شیطان بھی شریک تھے۔ سب کے سب حکومت آپا کی الل ٹپ باتیں سُن رہے تھے۔ وہ اپنی کار کا ذکر بار بار کر رہی تھیں۔ جج صاحب چاہتے تو اچھی خاصی کار لے سکتے تھے، لیکن نہ جانے انہیں اس فضول سی موٹر سے کیا دلچسپی تھی۔ جو اس پر بُری طرح فریفتہ تھے۔ ادھر ان کا سارا کنبہ اسی چیز پر لٹو تھا، لیکن ہمیں وہ زہر دکھائی دیتی تھی۔

آخر شیطان نے آہستہ سے کہا "دیکھو حکومت آپا اگر اب تم نے اپنی کار کے متعلق ایک لفظ بھی کہا ہے تو۔۔۔!" لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنی کار کے قصیدے پڑھتی رہیں۔ اب شیطان اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب متوجہ ہو گئے۔ یہ گلا صاف کر کے بولے۔

" خواتین و حضرات! آج میں چند الفاظ اس چیز کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ جسے غلطی سے کار کہا جاتا ہے۔ جو قطعی طور پر بے کار ہے۔ اس میں جب تک چند سٹول، کرسیاں اور مونڈھے نہ رکھے جائیں یہ

چلتی نہیں (وہ کار بہت ہی لمبی تھی) اور جب تک بیس پچیس آدمی نہ بیٹھیں،
اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ آپ اسے پٹرول سے ہرگز نہیں چلا سکتے۔ جب
تک اس میں مٹی کے تیل، سرسوں کے تیل اور دیگر چیزوں کا ایک خاص
مرکب نہ ڈالا جائے یہ نہیں چلے گی۔ آپ اسے پہاڑ پر چڑھائیں تو فوراً
چڑھ جائے گی، لیکن نشیب پر رک جائے گی اور ہرگز نیچے نہیں اترے گی۔
لہٰذا کچھ پتہ نہیں کہ یہ چلتی کب ہے اور ٹھہرتی کب ہے۔ اپنی مرضی کی مالک
ہے۔ اس میں ہارن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی مشین کا آرکسٹرا
آدھ میل سے سنائی دے جاتا ہے۔ لوگ ادھر اُدھر ہٹ جاتے ہیں۔
چوک کا سپاہی کانوں میں انگلیاں دے کر آنکھیں میچ لیتا ہے اور
جل تو جلال تو پڑھتا ہوا ایک طرف ہو جاتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو سینے
سے لگا لیتی ہیں۔ راہ گیر سہم جاتے ہیں اور دیر تک سہمے رہتے ہیں۔
ہمارے پڑوس میں اس چیز کا وہ رُعب ہے کہ بچوں کو اس سے ڈرایا جاتا
ہے کہ شرارت کرو گے تو وہ موٹر آ جائے گی۔ ایک دن اس میں دودھ
سے بھرا ہوا برتن رکھا تھا۔ جب تین چار میل جانے کے بعد اٹھایا
گیا تو دودھ پر مکھن تیر رہا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ پکنک پر جاتے
وقت ہم جلدی میں آئس کریم نہ بنا سکے، البتہ آئس کریم کی مشین میں
دودھ برف وغیرہ بھر کر مشین کار میں رکھ لی۔ جب وہاں پہنچے تو
نہایت ہی اعلیٰ درجے کی آئس کریم تیار ہو چکی تھی۔

اب جو معتبر ذرائع سے اطلاعات ملیں تو میں مسرت سے بے قابو ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ رضیہ کو محض میرا خیال رہتا ہے۔ وہ کھنچی کھنچی ضرور لگتی ہے، لیکن اس کی وجہ حکومت آپا ہیں۔

میں سیدھا شیطان کے پاس گیا اور کہا کہ اب تو ہمیں یقین ہو جانا چاہیے۔ میری حالت ان دنوں عجیب سی تھی جو کچھ شیطان کہتے فوراً یقین کر بیٹھتا۔ پہلے تو انہوں نے حسبِ معمول رضیہ سے بیزار کرانے کی کوشش کی۔ اس کے خیال سے باز آجانے کے لئے کہا۔ جب میں نہ مانا تو کہنے لگے کہ "دُنیا بہت وسیع ہے اور رضیہ کی نگاہ بھی کمزور ہے۔" میں پھر بھی نہ مانا تو انہوں نے ایک عجیب اوٹ پٹانگ سی تجویز بتائی۔ کہ میں رضیہ کو باغ میں ملوں۔ واپسی میں اناروں کے جھُنڈ کی طرف آؤں اور وہاں جو گڑھا ہے اس میں گر پڑوں اور بے ہوش ہو جاؤں۔ رضیہ ضرور سر دبائے گی۔ پھر غنودگی میں بڑبڑانے لگوں۔ اور رضیہ سے اصلیت صاف صاف کہہ دوں۔ بس اس وقت جو جواب ملے گا وہ آخری ہوگا۔

میں ہچکچایا۔ شیطان کہنے لگے "یہ آخری آزمائش ہے۔ اس مرتبہ ضرور فیصلہ ہو جائے گا۔ اس لئے ہمت کر ہی ڈالو۔" اور میں تیار ہو گیا۔ میں نے ننھی کو جاسوس بنایا کہ جونہی رضیہ باغ کی طرف جائے مجھے فوراً اشارہ کر دے۔ اشارہ پاتے ہی میں بھاگا اور رضیہ کو باغ میں جا لیا۔ پہلے تو اپنے ڈرامے کے متعلق پوچھا۔ بولی۔ "کچھ ایسا بُرا نہیں تھا۔" پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب واپس آنے لگے تو میں اسے اناروں کے جھُنڈ کی طرف لے گیا۔ اب وہ چھوٹا سا گڑھا آیا جہاں مجھے گرنا تھا۔ پگڈنڈی سے گڑھا دور تھا اس لئے میں گھاس پر چلنے لگا اور یکلخت خواہ مخواہ ٹھوکر کھا کر گڑھے میں کچھ اس طرح گرا کہ سچ مچ چوٹ لگی۔ دراصل

گرنے کی ریہرسل نہیں کی گئی تھی۔

رضیہ گھبرا گئی۔ اس نے مجھے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کیں۔ بچاری فوارے سے پانی بھی لائی۔ بھلا میں کہاں ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے ہدایت نمبر تین کے مطابق سرگوشی میں کہا۔ "رضیہ!" اور آنکھ جھپکا کر اسے دیکھا بھی۔

پھر آہستہ سے کہا۔ "رضیہ!" اور وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اب میرا سر دبایا جا رہا تھا۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا تھا لیکن مارے ڈر کے بُرا حال تھا۔ پورے ایک منٹ کے وقفے کے بعد پھر کہا۔ "رضیہ"! اور رضیہ چپکے سے بولی۔ "ہاں!"

اور میں جیسے آسمانوں میں اُڑنے لگا۔ اب اس نے میرا سر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ فیصلہ کُن جواب مل چکا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ناچنے لگوں۔ رضیہ کی انگلیاں بالوں سے کھیلتی کھیلتی گردن تک پہنچیں اور خوب بے تحاشا گدگدی ہوئی ہے، تو سارے جتن کر ڈالے۔ ہونٹ چبائے، چٹکیاں لیں، بہتیرا ضبط کیا، لیکن وہ کم بخت گدگدی قابو میں نہ آئی۔ اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اب جو رضیہ ناراض ہوئی ہے تو بس!

چلتے ہوئے بولی "مجھے یقین تھا کہ ڈراما ہو رہا ہے۔ بھلا اس تماشے کی کیا ضرورت تھی۔"

اور میں نے سوچا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ گدگدی سب کو ہوتی ہے، کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ لیکن رنج تھا تو یہ کہ اب رضیہ کبھی مجھ سے بات نہ کرے گی۔

— سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔

اگلی شام کو انتہائی اُداسی میں شیطان کو سارا قصّہ سُنایا۔ وہ بولے۔ "پہلے تو مجھے شبہ تھا، لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ رضیہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ اس میں رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ کوئی اچھا لگا کوئی نہ لگا۔! اور جب محبت کا جواب محبت میں نہ ملے تو وہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ ایسے موقعوں پر آب وہوا کی تبدیلی حیرت انگیز اثر رکھتی ہے۔ اب تمہیں یہاں رہ کر افسردگی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ کبھی تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ اور سمجھو کہ رضیہ کو کبھی دیکھا نہ تھا۔"

میں اور بھی اداس ہو گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا: "جہاں بھی جاؤں گا بہت ہی غمگین رہا کروں گا، کیونکہ مجھے رضیہ اچھی لگتی ہے اسے ہرگز نہیں بھلا سکتا۔"

ہم اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ آخر شیطان نے منوا کر چھوڑا کہ اس وقت یہی بہتر ہے کہ میں چپکے سے چلا جاؤں، بغیر جج صاحب کو اطلاع دیے۔

"اور کالج کے سرٹیفکیٹ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سب میں بھیج دوں گا۔" شیطان نے وعدہ کیا۔ اور ذرا سی دیر میں میں سامان باندھ رہا تھا۔ شیطان میری مدد کر رہے تھے۔

اتنے میں حکومت آپا آگئیں. پیچھے پیچھے ننھی تھی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھیں. میں نے جلدی سے صندوق بند کر دیے.

میری اور شیطان کی یہی خواہش تھی کہ یہ کسی طرح یہاں سے چلی جائیں.

شیطان بولے۔ "ننھی! دیکھ تو سہی ساتھ کے کمرے میں جو کلاک ہے وہ چل رہا ہے یا نہیں؟"

ننھی نے واپس آکر بتایا۔ "کلاک چل تو نہیں رہا کھڑا ہے. بس اپنی دم ہلا رہا ہے."

شیطان نے پھر پوچھا۔ "تو گویا چل رہا ہے نا؟"

"چل کہاں رہا ہے؟ چل کس طرح سکتا ہے بیچارہ؟ میخوں سے تو گاڑ رکھا ہے۔ بس اپنی دم ہلا رہا ہے۔" ننھی نے وضاحت کی.

حکومت آپا ہنس دیں۔

شیطان چڑ گئے "یہ بڑی ہو کر ہو بہو حکومت بنے گی. شاباش ہے حکومت! کیا لاجواب ٹریننگ دی ہے اس بچی کو۔ ستیاناس کر دیا."

وہ ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ شیطان بولے۔ "تمہیں چاہیئے کہ اسے سارے سبق پڑھا کر ایک سرٹیفکیٹ دے دو۔ اس طرح۔ کہ میں نے پورے چار سال تک اس بچی کو اپنے ساتھ رکھا اور اسے اچھی طرح بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں بڑے فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ ایک گستاخ، چھوری چٹوری اور ضدی لڑکی بن گئی ہے. لوگوں پر خواہ مخواہ فقرے کسنے میں تو اس نے مجھے بھی مات کر دیا ہے۔ ہر ایک سے چھیڑ، بزرگوں کا حکم نہ ماننا، اپنا وقت ضائع کرنا۔ ان میں یہ ایسی ماہر ہو گئی ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا جہاں بھی یہ جائے گی میرا نام روشن کرے گی. میری بدترین دعائیں اس

کے ساتھ ہیں۔" اس پر حکومت آپا نے ایک تیز سا جواب دیا اور باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ممی بولی "بھیا! اب تو آپ حکومت آپا کو ڈانٹ لیتے ہیں۔ ذرا ان کی شادی ہو جانے دو، پھر دیکھیں گے انہیں کون دھمکاتا ہے"

"اچھا تو حکومت کی شادی بھی ہو گی؟ ـــ کون کہتا ہے؟" شیطان نے ہو کر پوچھا۔

اب حکومت آپا ابل پڑیں "اور تمہاری بڑی ہو گی؟ دیکھ لینا جو کوئی لڑکی تمہارے نزدیک بھی کھڑی ہو جائے تو! خواہ مخواہ رضیہ کو بھی پریشان کر رکھا ہے اور (میری طرف اشارہ کر کے) اس بے چارے کو بھی۔"

ـــ اس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"حکومت تم جا کر کوئی مفرح شربت پیو۔ تمہاری صحت ـــ!"

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم ـــ!"

"خاک تھا تمہیں پتہ۔"

"اچھا تو کہہ دوں سب کچھ، کہ تم نے بچارے کو ـــ!"

"تم اپنا وقت بھی ضائع کر رہی ہو اور دوسروں کا بھی۔"

ـــ اور شیطان اور حکومت آپا کی خوب لڑائی ہوئی۔ حکومت آپا نے سب کچھ بتا دیا۔ مجھے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

میں نے شیطان کو کالر سے پکڑ لیا اور پوچھا "کیا سچ مچ تم رضیہ کو میرے خلاف ورغلاتے رہے ہو؟"

وہ بولے "ہاں!"

"ڈرامے میں تم نے ہی گڑبڑ کی تھی؟ اور وہ خودکشی تم نے ہی خراب کرائی تھی؟"

"ہاں! ہاں!"

"اور وہ —!"

"ہاں! ہاں!! ہاں!!! میں نے سب کچھ کیا تھا اور ابھی بہت کچھ کروں گا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ رضیہ تمہیں بالکل پسند نہیں کرتی اور اس کی نظر بھی کمزور ہے۔"

میں نے شیطان کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا مکا آ—

اتنے میں جج صاحب آ گئے، وہ مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے "میں نے سب کچھ سن لیا ہے، بیٹھ جاؤ۔ جب میں یورپ میں تھا تو وہاں ایک لڑکے سے میری کھٹ پٹ ہو گئی۔ ہمارے پروفیسر نے ہمیں جھگڑتے دیکھ لیا اور کہا کہ تم دونوں کے دلوں میں غبار ہے جسے نکال دینا نہایت مفید ہوگا۔ تم کسی نہ کسی دن آپس میں لڑو گے ضرور۔ چنانچہ وہ ہمیں کھیل کے میدان میں لے گئے اور وہاں GLOVES پہنا کر مکہ بازی کرائی۔ ہم خوب لڑے یہاں تک کہ دونوں تھک کر گر پڑے۔ اور جب ہم واپس آئے تو بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ اب تم دونوں ضرور آپس میں لڑو گے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ ہم سب باغ میں چلیں تمہارا فیصلہ وہاں ہو جائے گا۔" انہوں نے گلوز منگا لیے اور ہم سب کمرے سے باہر نکل آئے۔ نہایت ہی دلفریب چاندنی رات تھی۔ میں بیحد اداس تھا۔ ہر دفعہ قصور میرا ہی نکلتا ہے جہاں جاتا ہوں کوئی نہ کوئی گل کھلاتا ہوں۔

مجھے چاہیے تھا کہ چپ چاپ یہاں سے چلا جاتا۔ جب رضیہ کو مجھ سے نفرت ہے تو پھر باقی کیا رہ گیا۔ اب یہ بات سب میں پھیل جائے گی۔

اور تو اور جج صاحب نے بھی سب کچھ سُن لیا۔ توبہ! توبہ! ایک تماشا اور باقی رہ گیا تھا سو وہ اب ہو رہا ہے۔ بس میں رات کی ٹرین سے گھر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی منہ نہ دکھاؤں گا۔

پلاٹ میں بجلی کے قمقمے جل رہے تھے۔ طے ہوا کہ وہاں مقابلہ ہو۔ ہمیں گلوز پہنائے گئے۔ جج صاحب نے گھڑی ہاتھ میں لی۔ ہمارے چاروں طرف سارا کنبہ کھڑا تھا۔ جج صاحب نے پوچھا۔ "کتنے راؤنڈ؟" میں نے کہا۔ "جتنے آپ چاہیں!" شیطان بولے۔ "تین۔" جج صاحب نے کہا۔ "تین میں تو فیصلہ نہیں ہو پائے گا' پانچ سہی۔"

پہلا راؤنڈ شروع ہوا۔ نہ جانے میرے ہاتھ پاؤں کیوں شل ہو رہے تھے۔؟

بغیر کسی مدافعت کے شیطان سے پٹ رہا تھا۔ سب بچے میری طرف تھے۔ اور ہمت بندھا رہے تھے۔ رضیہ ایک طرف اکیلی کھڑی تھی۔ بالکل چپ چاپ۔

پہلا راؤنڈ شیطان کا رہا۔ دوسرے میں پھر انہوں نے پیٹنا شروع کیا اور میں بُت بنا کھڑا تھا۔ یہاں تک کہ میرا ایک مکا بھی ان کو نہ لگ سکا۔ بچے چلا چلا کر میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ شاید یہی کہ مقابلہ ختم ہوتے ہی فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ایک ٹرین رات کے گیارہ بجے جاتی ہے۔

تیسرے راؤنڈ میں بھی یہی ہوا۔ شیطان اچھل اچھل کر حملہ کرتے اور میری جانب سے مدافعت تک نہ ہوتی۔

تیسرا راؤنڈ ختم ہوا۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ رضیہ نے میرے کان میں کچھ کھُسر پھُسر کی۔ کچھ کہہ دیا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "سچ ؟"
بولی۔ "ہاں !"
اور میری آنکھوں کے سامنے تتلیاں ناچنے لگیں۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

چوتھا راؤنڈ شروع ہوا۔ میرے گلوز نے حرکت کی۔ دھڑام۔ دھڑام — دھڑام — چند آوازیں آئیں اور شیطان بے ہوش پڑے تھے۔

وہ ناک آؤٹ ہو گئے تھے۔ جج صاحب نے میرا بازو ہوا میں بلند کر کے ہلا دیا اور رضیہ میرے گلوز اتارنے لگی۔
حکومت آپا بولیں۔ "مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ !"

میں اور رضیہ فوارے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ہم نے وہ گڑھا بھی دیکھا جہاں میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم دونوں مسکرانے لگے۔ نہایت ہی دلفریب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ایسی چاندنی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ رضیہ نہایت ہی خوبصورت لڑکی ہے اور ایسی لڑکی بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور جب ہم معطر پھولوں کے تختوں میں سے گزرے تو فضا میں ایک سناٹا تھا۔ خوشگوار سناٹا ! تب مجھے پتہ چلا کہ شیطان تو میرے رقیب

بیٹھے۔ اور حکومت آپا اپنا وقت بھی ضائع کر رہی تھیں اور دوسروں کا بھی۔